

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۳۵۲

Accession No. ۶۵۶۵

Author: میرزا رفیع

Title: سیرت فرید

This book should be returned on or before the date last marked below.

سیرۂ سید

یعنی
حالات زندگی
نواب دبیر اللہ ولہ میں الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر صلح جنگ

وزیر

ابو المنصور عین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

مؤلفہ

ڈاکٹر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی

موروثی خطاب شاہی

جو والدہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ

در مطبع منقذہ کرم باہتمام قادیان خان صوفی طبع شد

سیرۂ سید

یعنی
حالات زندگی

نواب دبیر اللہ ولہ میں الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصدح جنگ

وزیر

ابو المنصور حسین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

مؤلفہ

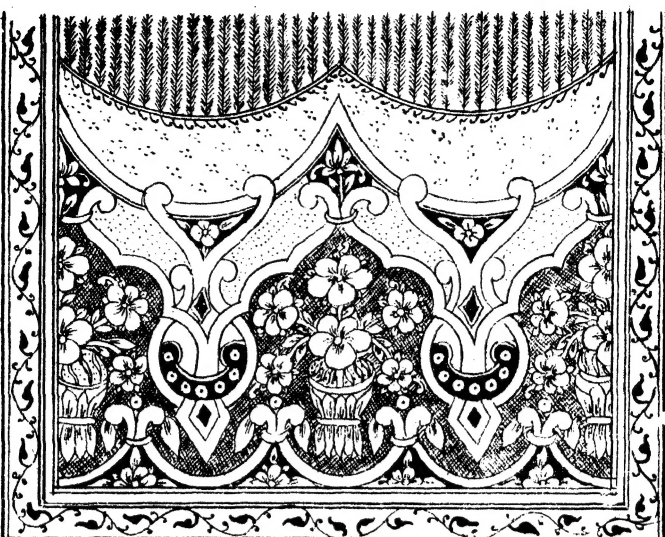
ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی

موروثی خطاب شاہی

جواد اللہ ولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ

در مطبع نقیہ کرم پور ہما قایم خان صوفی طبع شد

۱۳۹۶ھ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرت فریدیہ

یعنی

حالاتِ ندگی نواب بیبر الدین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان

مصلح جنگ وزیر اکبر شاہ ثانی

خواجہ فرید الدین احمد خان جنگو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں عمدہ وزارت اور مذکورہ بالا خطا
ملا تھا حضرت خواجہ یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں جو کافر و مروین ہے اور شاہ ہمدان کے
لقب سے مشہور ہیں۔

ہمدان عراق عجم مملکت ایران کا ایک شہر طہران سے ایک سو ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ شہر نہایت آباد اور تجارت گاہ تھا۔ تیمور نے اسکو تباہ کر دیا بعد ازاں بلخ میں اسکا عرض بلد ۳۶ درجہ اور طول بلد مغرب سے ۷۳ درجہ لکھا ہے۔ انگریزی منہ سونے اسکا عرض بلد ۳۴ درجہ ۵۰ دقیقہ اور طول شرقی گرینچ سے ۴۸ درجہ ۳۲ دقیقہ قرار دیا ہے۔

خواجہ یوسف ابن الیوب ابن یوسف الہمدانی اولیائے کبار میں تھے اور نکالقب ابو یعقوب ہے وہ سنہ ۵۸۶ ہجری مطابق سنہ ۱۱۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۵۳۵ھ مطابق سنہ ۱۱۴۰ء میں بمقام مامین جو مرو کے راستے پر ہے انتقال کیا۔ اول انکے جنازہ کو وہیں دفن کر دیا اور پھر مرو میں لجا کر اس مقبرہ میں جو انکے نام سے مشہور ہے دفن کیا۔ بچا نوے برس کی عمر ہوئی۔ بغداد میں انہوں نے تعلیم پائی اور ابو اسحاق فقیہ سے علم فقہ پڑھا۔ انکا مذہب حنفی تھا اور شیخ عبد اللہ جوینی کے مرید تھے اور ان ہی سے فرقہ خلافت پایا تھا عراق عجم اور خوارزم اور خراسان اور ماوراء النہر میں انکی کمال شہرت تھی۔ مرو میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ عبد اللہ برقی۔ خواجہ حسین انداتی۔ خواجہ احمد بسوی۔ خواجہ عبد الخالق غنجدانی انکے خلفائے کبار میں سے ہیں۔ (تاریخ یافعی۔ نفحات الانس جامی۔ سفینۃ الاولیاء۔ انوار العارفین۔ طبقات الکبریٰ عبد الوہاب شعرانی)۔

انکے انتقال کے بعد انکی اولاد مرو سے کشمیر میں جا بسی تھی۔ کشمیر میں اور

ملکوں کی مسلمان اگر آباد ہوئے۔ مگر وہ کشمیری الاصل نہیں ہیں۔ بلکہ نذیل کشمیری ہیں۔
 کشمیری الاصل وہی ہیں جو وہاں کے اصل باشندے تھے اور مسلمان ہو گئے ہیں۔
 کشمیر کے اصل باشندے اپنے گوت کا ایک لقب رکھتے ہیں اور اسکو آل کہتے
 ہیں۔ اس زمانہ میں بھی تمام کشمیری ہندو جو کشمیری پنڈت کہلاتے ہیں اپنے نام کے پٹا
 اپنا آل لگاتے ہیں۔ ان میں سے جو مسلمان ہو گئے ہیں وہ بھی نذیل کشمیری آل کو
 یاد رکھتے ہیں اور گویا وہ نشانی ان کے کشمیری الاصل ہونے کی ہے۔ جو نذیل مسلمان شد
 وراز سے کشمیر میں رہنے لگے ہیں اور وہاں ان کی شتین گذر گئیں وہ بھی کشمیری کہلاتے
 ہیں۔ مگر ان کے ساتھ کوئی آل جو کشمیری الاصل ہونے کی علامت ہے نہیں ہوتا۔ خواجہ
 یوسف ہمدانی کی اولاد اور خواجہ عبدالعزیز کی اولاد جو کشمیر میں آباد ہو گئی وہ اصل انہوں کا
 لقب خواجہ کا تھا۔ مگر ہندوستان میں بہت سی مسلمان کشمیریوں نے بھی جو کشمیری الاصل
 ہیں یہ لقب اختیار کر لیا ہے۔

خواجہ فرید الدین احمدؒ ۷۱۱ھ ہجری مطابق ۱۳۱۰ء کے دہلی میں پیدا ہوئے۔
 ان کے والد کا نام خواجہ اشرف تھا۔ ان کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بطریق تجارت
 دہلی میں آئے تھے۔ اور کشمیری آل کی تجارت کرتے تھے اور ریشم کی تجارت کا بہت بڑا
 کارخانہ تھا۔ انہوں نے دہلی ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا۔

خواجہ اشرف کے آٹھ بیٹے تھے۔ خواجہ فرید الدین۔ خواجہ علاء الدین۔ خواجہ
 شہاب الدین۔ خواجہ نور الدین۔ خواجہ محی الدین۔ خواجہ نجیب الدین۔ خواجہ سام الدین

خواجہ کمال الدین۔ انہیں سے جو سب سے بڑے نامی ہوئے اور جنکو ہزاروں آدمیوں نے سجدہ کیا اور معبود اللہ کما وہ خواجہ نجیب الدین تھے وہ ابتدائی عمر سے سول شاہی فقیر ہو گئے تھے جو سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ جی کے پیروں کا پیدا ہو گیا تھا اور مولوی محمد صغیف جو رسول شاہ جی کے جانشین تھے خواجہ نجیب الدین کو چیلے ہو گئے تھے۔ اور ان کے پیر نے فدا حسین اور کانا م رکھ دیا تھا۔ شاہ فدا حسین نے تمام علمی کتابیں اپنے پیر سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو اپنے مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں۔ اور کانا مشرب اور عمل وحدت جو دہرہ تھا اور وضع یہی کہ ڈاڑھی مونچہ کا صفایا۔ ایک لنگوٹی باندھے۔ اور سارے بدن پر کویلے کی اکھڑے ہوئے جو بہت کلماتی تھی بیٹھے رہتے تھے۔ اگر حجرہ سے باہر نکلتے تو ایک سمت گھٹنوں تک لپیٹ لیتے تھے اور سر پر ایک مثلث و مال باندھ لیتے تھے۔ انہوں نے اٹھارہویں محرم ذی قعدہ ۱۰۵۹ھ ہجری مطابق ۱۶۴۳ء میں انتقال کیا اور کانا راہور میں سول شاہیوں کے تکیہ میں ہے جو جمیلی باغ کہلاتا ہے۔

شاہ فدا حسین بہت مستعد عالم تھے اور کبھی کبھی کسی کو فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات حضرت محی الدین ابن عربی اور دیگر اہل وحدت وجود کی نہایت عمدگی اور خوبی سے پڑھاتے تھے۔

خواجہ علامہ الدین صاحب نے بھی مثل بزرگان دین کے درویشی اختیار کی تھی اور طریقہ علیہ نقشبندیہ میں شاہ محمد آفاق صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے

اور حج بیت اہد اور زیارت مدینہ منورہ و اکی تھی۔ اگرچہ انہوں نے تامل کیا تھا مگر تمام عمر گوشہ نشینی اور ذکر و اذکار و زہد و مجاہدہ میں گذرانی اور ۲۰ ہجادی لاول و فریکشنہ ۸۵۵ھ ہجری مطابق ۱۴۵۵ء کے انہوں نے انتقال کیا۔ ان کے تین بیٹے تھے خواجہ ضیاء الدین صاحب جو ایک مشہور واعظ تھے اور خواجہ کمال الدین صاحب ان دونوں صاحبوں نے انتقال کیا مگر ان کے سب سے بڑے بیٹے حکیم خواجہ بہار الدین صاحب جاورہ میں موجود اور اس وقت تک زندہ ہیں۔

خواجہ حسام الدین نے اپنی جوانی میں دریائے چنبل میں ڈوب کر اور خواجہ کمال الدین نے عالم شباب میں مرض موت میں مبتلا ہو کر انتقال کیا تھا۔

خواجہ شہاب الدین عربی نسخ خط لکھنے کے استاد تھے اور انگریزی عملداری میں کسی حکمہ میں ناظر ہو گئے تھے۔

خواجہ محی الدین کو سرکار بادشاہی میں تعلق ہو گیا تھا اور خواصان شاہی کے سرچوکی ہو گئے تھے۔

خواجہ نور الدین کو چند روز تک دربار سیدہ بیہ میں فوج سواروں میں کوئی عہدہ افسری کامل گیا تھا۔

مگر خواجہ فرید الدین احمد بہت زیادہ قبال مند ہونے والے تھے۔ ان کو ابتدا سے تحصیل علم کا بہت شوق تھا اور علوم ریاضیہ سے انکو طبعی مناسبت تھی وہ علم کی تحصیل کی طرف متوجہ تھے۔ دلی میں انہوں نے درسی کتابوں کو تمام کیا دلی

میں کوئی شخص علوم یا ضیہ میں یادہ شہور نہ تھا۔ مگر علامہ تفضل حسین خان لکھنوی تمام علوم میں اور خصوصاً علوم یا ضیہ میں نہایت شہور تھے اور لوگوں نے علامہ کا لقب اونکو دیا تھا۔ خواجہ فرید الدین احمد علوم یا ضیہ کی تحصیل و تکمیل کے لیے لکھنو گئے اور انتہا درجہ تحصیل کی جو کتابیں علوم یا ضیہ کی ہیں ان سے پڑھیں اور دو تین سال وہاں رہ کر دلی واپس آئے۔

یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ کیونکہ نواب آصف الدولہ ۲۵ فریقہ ۸۸ھ مطابق ۱۲۴۷ھ کے مسند نشین ہوئے تھے اور ۹۵ھ ہجری مطابق ۱۲۸۸ھ کے اونہوں نے لکھنوکو دارالریاست قرار دے لیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۲۸۷ھ ہجری مطابق ماہ ستمبر ۱۲۹۷ھ کے ہوا۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۲ شعبان ۱۲۸۷ھ ہجری مطابق یکم جنوری ۱۲۹۷ھ نواب سعادت علی خان مسند نشین ہوئے۔

علامہ تفضل حسین خان پہلے جنرل پامر کے پاس منشی تھے۔ پہلے انکی سفارش سے نواب آصف الدولہ نے ان کو اپنا سفیر کر کے کلکتہ بھیجا تھا اور جب وہ لکھنو میں آئے تو عمدہ نیابت بھی اونکو مل گیا تھا۔ نواب سعادت علی خان کے عہد میں علامہ تفضل حسین خان دوبارہ عمدہ سفارت کے امیدوار ہو کر کلکتہ گئے۔ مگر نواب سعادت علی خان نے سفارت اونکے پاس نہ بھیجی۔ اس لیے وہ کلکتہ سے واپس ہوئے اور اٹنا سا راہ میں بمقام تہاڑی باغ ۱۵۱۵ھ ہجری مطابق ۱۲۹۹ھ کے

انہوں نے انتقال کیا۔

دلی میں ایک اور کشمیری خاندان خواجہ عبدالعزیز احرار کی اولاد میں کشمیر سے اگر آباد ہوا تھا خواجہ فرید الدین احمد کی شادی غالباً ۹۳۱ھ ہجری مطابق ۱۵۲۹ء میں خواجہ محمد مراد احرار سی کی بیٹی سے ہوئی۔ پادشاہان دلی کے عہدین چار مغز عہدے تھے۔ ایکٹ ملک العلاء۔ کا جس قدر علی پادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اور انکو جو انعام و اکرام یا جاگیر منصب ملتا تھا وہ سب ملک العلاء کے ذریعہ سے ملتا تھا۔ دوسرا ملک کھاکا۔ جو شخص یہ عہدہ رکھتا تھا اسی کے ذریعہ سے تمام طبیب دربار شاہی میں پیش ہوتے تھے۔ تیسرا ملک الشعر اکا۔ اس عہدہ دار کے ذریعہ سے تمام شعرا بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو سکتے تھے۔ چوتھا ایک عہدہ تھا جسکی مساطت سے درویش اور مشائخ پادشاہ کے پاس جا سکتے تھے اور وظائف اور دراز اوسی کے ذریعہ سے انکو دیے جاتے تھے۔ اور تمام درگاہوں کا سالانہ خرچ اور درگاہوں کے عرس اور فاتحہ وغیرہ کے اخراجات اوسی کے ذریعہ سے ہوتے تھے۔ اس عہدہ کا نام ملک الاولیا تو نہیں قرار پاسکتا تھا اسلیے اس عہدہ کا نام نقیب الاولیا قرار دیا گیا تھا خواجہ محمد مراد احرار سی عہدہ پر مامور تھے جو ایک نہایت بزرگ اور عالی رتبہ تھے۔

خواجہ فرید الدین احمد کی ایک ہی بیوی تھیں اور ان سے پانچ اولاد میں پیدا ہوئی تھیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ اور یہ اولاد میں تین۔ تین برس کے فاصلہ سے غالباً ۹۴۰ھ مطابق ۱۵۲۹ء کے پیدا ہو چکی تھیں۔

۱۲۰۰ھ ہجری مطابق ۱۷۹۷ء کے خواجہ فرید الدین احمد پیر لکھنوی گئے۔ یہ زمانہ
 ہی نواب آصف الدولہ کا تھا۔ مگر چند روز بعد ہی نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا
 اور نواب سعادت علی خان سندھ نشین ہوئے۔ اس موقع کے سفر لکھنؤ میں جو نہایت
 دلچسپ ام پیش آیا وہ خود خواجہ فرید الدین احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے سالہ ستم
 فوائد الافکار فی اعمال الفرجاء کے دیباچہ میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جس کو ہم
 بعینہ نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ درچنین گوید مولف این سالہ فرید الدین احمد کہ چون فقیر از ازیام
 طفولیت شوق بود بعلم ریاضی و در حال تحصیل جنہی ازین علم حاصل ہنودہ و اکثر بمطالعہ
 کتب ریاضی می پرداخت در بعضے حواشی نظر آمدہ کہ پرکار متناسبہ از جملہ آلات ریاضی بود
 کہ از ان اکثر اعمال نجومی و بعضے اشکال ہندسی مسائل حسابی باسانی استخراج می شد
 حالاً علم و عمل آن بسبب نایابی آن کہ مفقود است نیز زبانی بعضے استادان مجہدین مذکور
 پس از ان اشتیاق آن بدل دہستم و از ہر کس ریاضی ان کہ تذکرہ آن میکردم میگفت کہ
 ماندیدہ ایم و شنیدہ ایم غلط باشد پرکار ہمین است کہ برائے سم دائرہ و پیمایش خطوط
 بکار می آید دیگر دہستم پرکار نیست۔ بعد ازاں در ۱۲۰۰ھ ہجری این فقیر در لکھنؤ وارد شدہ
 و از جنرل مارٹین و سترگوراوزلی کہ حکیم مشرب بود ملاقات شدہ نزد او شان یک اکہ عجیب
 و غریب دیدم از برج و آہن مرکب بود پیرہ نوکدار ہرسم ہنودہ و در کمر آن منیخ مثل منہ
 بند کردہ مگر منیخ این آلہ از جاسی خود حرکت میکرد تا آنرا از جا حرکت دادہ و در وزن و یک

از ستر آن بدارند و بر هر دو سطح آن خطوط چند بود چون گاه بی این قسم چندیده بود قسم
 کردم گفتند که نام این در زبان انگریزی یعنی پرکار تقسیم است ازین آنکه تقسیم خطوط و دوازده
 سطوح و اجسام مختلفه باسانی میشود چون آن که از جنزل مارین بود از اوشان عاریت گرفت
 و دانستم که پرکار متناسبه همین باشد چون هر چهار عمل که در آن موضوع بود مفسر اوزلی روبرو
 من کرده بود و بیکان خود آورده اعمال آن کردم و بسیار فکر کردم که چیزه از اعمال نجومی
 از آن استخراج شود هیچ نشد دانستم که این پرکار متناسبه است مگر چند روز محنت کرده بدلا
 اصول طور صنعت آن مستنبط کردم و مانند آن یک پرکار نفت و تیار کردم مفسر اوزلی آن
 گرفته به نواب وزیر سعادت علی خان بهادر گزرا نید و از دیدن این پرکار بسیار متعجب
 گفت که اکثر مردم از اعمال این پرکار آشنایند چه جاب صفت آن که در اینجا کس
 نمیداند و در ولایت هم هر کس از صنعت این آگاه نیست و من این قدر میدانم که یک آله
 و گنج پرکار مایع باشد باستعانت آن این پرکار درست میکنند و در وضع درست کردن آن
 نمیدانم شما بدون آن چه طور ساختید چون این جانب گاه گنج پرکار بماندیده بود و شتاب
 دیدن آن شدم و اوشان گنج پرکار را از صند و تکی خود بر آورده بمن ملاحظه کنانید و چون
 بر آن آله خطوط و رقوم بسیار دیدم و از اوشان تفسار حال آن نمودم گفتند که عمل و سه
 خط میدانم چنانچه روبرو بنده عمل تقسیم خط و استخراج و ترویجیب کرده گفتند که
 من همین قدر میدانم لیکن شنیده ام که ازین آله اعمال بسیار از قسم دریافت ظل و قطر آن و
 خطوط متوالیه و اکثر اعمال نجومی میشود مگر من نمیدانم بلکه اکثر صاحبان انگریز هم نمیدانند الا

مندسان استم کہ پرکار متناسبہمین باشد و چون آن گنج بسیار عمدہ و تحفہ بود نحو استم
کہ از عبارت بگیرم اگر چہ لم بسیار آرزو مند شد بعد آن چند پرکار تقسیم برنجی مرتب کرد
و قوم آن بجای انگریزی فارسی کندہ کردم و باشنایان خود و آدم بعد چندے اردو کلکتہ
شد و یک گنج پرکار با خرید نمود کہ در آن آئندہ کور ہم بود پس مرپی دریافت اعمال شنیدم
و فکر وسیعی بسیار نموده عمل استخراج ظل و قطر ظل و اکثر اعمال نجومی و ہندسی متنبہا کردم
چنانکہ مسودت بسیار شد پس یقین شد کہ پرکار متناسبہمین ہست کہ سابق در عرف عجم
مروج باشد و حال این کسے نمیداند و مختص در صاحبان انگریز و فرانس مر و جست۔
پس آن مسودت اعمال بطور قیاس خود مرتب نمودہ صاف کنانیدم و برائے یادگار
و فائدہ شائقان این علم سالہ درست نمودم و نام این سالہ فوائد الافکار فی
اعمال الفرجار نهادم۔ انتہی۔

اوس زمانہ میں مدرسہ کلکتہ میں جسکو حکام انگریزی نے قائم کیا تھا ایک سبٹر
مقرر کرنے کی ضرورت تھی جسکی خواہ سات سو روپیہ تھی لکن توین جو حکام انگریزی
انہوں نے خواجہ فرید الدین احمد کی سفارش اوس عمدہ کے لیے کی اور اوس پر واکا
ہو گیا۔ اور وہ اوسی سنیہ میں یا اوس کے تھوڑے زمانہ ہی کلکتہ میں پہونچے جیسا کہ
خود انہوں نے اپنی اوس کتاب کے دیباچہ میں بعد ذکر حالات لکھنو لکھا ہے
کہ دو بعد چندے وارد کلکتہ شد م، اوس زمانہ میں مارکوئس آف ولزلی گورنر
جنرل تھے۔ خواجہ فرید الدین احمد نے کلکتہ میں پہونچکر اپنے عمدہ کا چارج لیا

اور اپنا کام کرتے رہے۔

اوس زمانہ میں دلی میں شاہ عالم بادشاہ تھے اور ایران میں فتح علی شاہ مشہور ہو رہا تھا کہ زمان شاہ کابلی نے ہندوستان پر حملہ کرنے اور اوسکے فتح کرنے کا ارادہ مصمم کر لیا ہے اور اوسکے فرمان بھی راجگان پنجاب کے نام میں مضمون کے آگے تھے کہ برسات کے بعد دہلی پر جو خیم گاہ سلاطین تیموریہ ہے یورش کرو گناہ و سرگناہ انگریزی اس فکر میں تھی کہ کسی طرح زمان شاہ کا ہندوستان پرورش کرنا روکا جاوے۔ اوس زمانہ میں انگریزوں کی طرف سے سٹرمینسٹی پوشہ میں بطور سفیر کے متعین تھے اور سر بر فوڈ چیس بارونٹ بغداد میں اور نواب مرزا محمد علی خان بہادر شہت جنگ گورنر بمبئی کی طرف سے دربار ایران میں سفیر مقرر ہوئے تھے وہ بٹہر میں آئے اور حاجی محمد خلیل خان کے ذریعہ سے فتح علی شاہ پادشاہ ایران اور وزیر ایران سے اس امر میں خط و کتابت جاری کی اور زمان شاہ کے بہائیوں محمود شاہ و فیروز شاہ کو افغانستان پر حملہ کرنے کو آمادہ کیا۔ اس خبر کے سننے ہی زمان شاہ طراپشاہ سے ہرٹ کو چلا گیا اور ہندوستان پر حملہ کرنا ملتوی ہو گیا۔ اور کپتان مالکوم سے جو بطور سفارت ایران پہنچ گئے تھے اور فتح علی شاہ سے رمضان ۱۲۵۷ھ ہجری مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۴۱ء کے ایک عہد نامہ تحریر ہوا کہ حاجی ابراہیم خان زیراعظم شاہ ایران اور کپتان مالکوم صاحب کے دستخط سے مکمل ہوا۔ اور جب کپتان جان مالکوم دربار ایران سے واپس آئے تو فتح علی شاہ نے حاجی محمد خلیل خان کو سفیر مقرر کر کے

بمبئی کو روانہ کیا۔

حاجی محمد خلیل خان ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ کے بمبئی میں پہنچے۔ نہایت تعظیم و تکریم سے انگریزوں کی جانب سے استقبال ہوا اور جس مکان میں ٹھہرائے گئے وہاں ایک کپنی سپاہیوں کی بطور اظہار تعظیم تعینات کی گئی۔

اتفاقاً ایک دن حاجی محمد خلیل خان کے ساتھیوں اور کپنی متعینہ کے سپاہیوں میں کسی امین تکرار ہوئی اور ہتھیاروں تک نوبت پہنچی۔ حاجی محمد خلیل خان اس جھگڑے کے رفع دفع کرنے کو اندر سے باہر نکلے اور اتفاقاً ایک گولی اونکے لگی اور وہ مارے گئے۔ یہ واقعہ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ کے

واقعہ ہوا۔ مارکویس آف ولزلی کی گورنر جنرل نے اس اتفاقہ حادثہ پر بہت رنج اور افسوس ظاہر کیا اور میجر مالکوم اسٹرٹوٹ کو جو کلکتہ میں تھے واسطے تشفی و دل دہی پس ماندگان حاجی محمد خلیل خان کے بمبئی کو روانہ کیا۔ چنانچہ وہ (۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو کلکتہ سے روانہ ہوئے۔

اسٹرٹوٹ راہ میں بجایا ہو گئے اور میجر مالکوم ۱۹ ستمبر کو بمبئی بندر میں اور رازہ خشکی حیدر آباد دکن ہو کر ۱۸ اکتوبر کو بمبئی پہنچے اور پس ماندگان حاجی محمد خلیل خان کی بخوبی تسلی و تشفی کی اور نومبر ۱۸۵۷ء کو کلکتہ واپس چلے گئے۔

علاوہ اسکے مارکویس آف ولزلی نے ایک تعزیت نامہ سٹرٹوٹ کے ہاتھ جو بصرہ میں بطور سفیر مقرر تھے فتح علی شاہ کے پاس بھیجا اور فتح علی شاہ شاہ ایران نے بھی اس واقعہ کا اتفاقہ واقع ہونا تسلیم کیا۔

اس زمانہ میں نواب مہدیعلیخان چشت جنگ سرکارانگریزی کی طرف سے ابوشہر
میں سفیر تھے۔ یگر سرکارانگریزی نے کسی سبب سے انکو اس عہدہ سے علیحدہ کر کے
واپس بلالیا۔

چنانچہ تاریخ سفارت حاجی طیل خان محمد بنی خان بن جوئے اعین بھٹی میں
چہپی ہے بصفحہ ۱۶ و ۱۷ فقرہ لکھا ہے۔ ”وقوسلگری بندر ابوشہر درین آوان بآوا
مرزا مہدیعلیخان چشت جنگ بہادر حوالہ و چون او منخواست کہ بدولت خود حسن خدمتی
نماید و منخواست کہ مسئولیت و بار و تہمت مہم انکشی از دوش دولت انگلیس بزرگوار بقفل
ناقص خود تدبیرے اندیشید و از واقعہ قتل حاجی طیل خان خبر ہای دروغ بولایات اطراف
انتشار میداد و این بطریقیکہ مسئولیت آن بخود آن مرحوم عائد میگردد و حالانکہ هیچ حاجت
بانتشار آن نوع خبر ہای دروغ نماندہ بود و حادثہ مذکور را مردم ایران بنظر تعجب ملاحظہ میکردند
کہ آید این کار چہر ادوات انگلیس این ہمہ اصرار میکند و بجای انہمہ مصارف گزاف ہر گاہ
یک سفیرے دیگر بدربار ایران فرستادہ بود ہر مینہ ازین بدنامی باہر و ن می آمد و رفت
دربار ایران حاصل نمینود و جماعت انگلیسیہ بدین سبب نواب مدد و راقصہ نمونہ از ابوشہر
عزلش نمودند و بموجب دادند۔

ان اوقات کے بعد گورنر جنرل مارکوئیس آف لرنلی نے ایک خط معذرت کا بنام
شاہ ایران اور ایک سفارت کا دربار ایران میں جس کا صدر مقام ابوشہر میں ہوتا تھا بھیجا
تجویز کیا اور سٹروٹ جو بھٹی میں تھے خط معذرت لیجائے کہ تجویز ہوے اور سچو بالکم

کے پاس مہربانی میں وہ خط بھیجا گیا کہ سٹر لوٹ کے ہاتھ روانہ کیا جاوے۔ مگر وہ سبب
 بیماری کے نہ جاسکے اور میجر مالک نے خواہش وقت مہربانی میں تھے بذریعہ اپنی چٹھی بنام
 چراغ علی خان لکھا کہ سٹر لوٹ کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے سٹریا زلی کو ذوال گورنر
 کا خط بنام شاہ سپر دیا گیا ہے کہ وہ لیجاوین اور پراہنی چٹھی مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۶۷ء
 میں سٹریا زلی کے پوٹیکل سکرٹری کو لکھا کہ سٹر لوٹ کا عقب سے جاننا ضرور ہے۔
 مگر خط معذرت گورنر جنرل کا بذریعہ سٹریا زلی جو سفیر بصرہ میں تھے شاہ کی خدمت میں
 پہنچایا گیا جیسا کہ ہم اوپر لکھا آئے ہیں اور اسکا ذکر تاریخ سفارت حاجی خلیل خان و
 محمد نبی خان میں جو ۱۸۶۷ء میں مہربانی میں بھیجی ہے بصفحہ ۱۸۷۱ء میں مذکور ہے۔
 دو مارکویس ولزلی ایک معذرت نامہ مصحوب سٹریا زلی بصرہ و دیگران با جاہر
 سیاہ کہ نشان غرا واریت بدر بار ایران فرستاد و نامہ دہرایا می فوق را ایشان برداشتہ
 بحضور اعلیٰ حضرت فتح علی شاہ رفتند کہ کین از مامورین نظام و یک کمپنی سپاہ نظام تاریخ
 وقوع این حادثہ در بند مہربانی محبوسند و این حادثہ ناگاہ روئے اودہ و اعلیٰ حضرت پادشاہی
 نیز از راہ مراحم بکیران شہانہ برہائی محبوسین فرمان داد و نامہ دہرایا ایشان پذیرفتہ
 و سٹریا زلی بجل ماموریت خوشین برگشتہ،
 مارکویس آف ولزلی نے سٹر لوٹ اور خواجہ فرید الدین احمد و لون کا بھیجا تجویز
 کیا۔ انکی تاریخ روانگی ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہوتی۔ مگر غالباً سنہ ۱۸۶۳ء مطابق
 سنہ ۱۲۸۱ ہجری کے روانہ ہوئے ہونگے۔

کسی انگریزی تاریخ سے جہاں تک پہنچنے تلاش کی مسطوط کا ایران یا بوشہر پہنچنا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ وکی و انگلی ہی معلوم نہیں ہوتی۔ خواجہ فرید الدین احمد کا دستور تھا کہ وہ برابر اپنا روزنامہ لکھا کرتے تھے۔ اور عہد شباب سے اونکے ہاتھ سے دو ہفتہ پیشتر کا روزنامہ لکھا ہوا موجود تھا اور اس میں نے بارہا اسکو بطور ایک دلچسپ تاریخ کے پڑھا تھا۔ مگر فحش ہے کہ زمانہ غدر ۱۳۰۷ء میں وہ روزنامہ تلف ہو گیا۔ راقم کو یاد پڑتا ہے کہ اوس روزنامہ میں لکھا تھا کہ دو مسطوط بیمار ہو گئے اور گورنر جنرل کے حکم سے خواجہ فرید الدین احمد بطور سفیر مستقل کے روانہ ہوئے۔ بوشہر پہنچنے کے بعد شیراز اور طہران میں گئے اور کئی دفعہ فتح علی شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور فتح علی شاہ کی مہربانی اونکے حال پر خصوصاً ملحوظ اونکے اعلیٰ درجہ کے علوم یا ضیہ کے جاننے کے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

بوشہر اور شیراز اور طہران میں جو واقعات گذرے ہوں اونکے تفصیل لکھنے کا بسبب تلف ہو جانے روزنامہ کے کوئی ذریعہ نہیں ہا۔ مگر جہاں تک کہ راقم کو بالا جمال یاد ہے وہ اس قدر ہے کہ خواجہ فرید الدین احمد نے شاہزادہ حسین علی میرزا اور صادق علیخان اور چراغ علیخان نوامی بیکبرگی (یہ بھی چراغ علیخان ہیں جنکے نام بیکبر بالکم نے چھپی لکھی تھی) سے جو دربار شاہی میں رسوخ رکھتے تھے بہت زیادہ دوستی پیدا کی تھی اور ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے جو مقاصد سفارت کے تھے اونکو بخوبی انجام دیا تھا بڑا مقصد اس سفارت کا یہ تھا کہ شاہ ایران کو بجائے حاجی خلیل خان مقتول کے

ہندوستان میں دوسرے سفیر کے بھیجنے کی ترغیب بجاوے تاکہ دوستی اور ارتباط
دونوں سلطنتوں کا قائم رہے۔ اور شاہ کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ وہ حقیقت
حاجی خلیل خان کے مارے جانے کا واقعہ ایک امر اتفاقی تھا اور گورنمنٹ انگریزی کوئی
الزام اوسکا اوس مرحوم کی نسبت خیال نہیں کرتی جیسا کہ نواب مرید علی خان نے اوسکو
شہرت دی تھی۔ اس مقصد میں بخوبی کامیابی ہوئی اور شاہ نے دوسرے سفیر ہندوستان
میں بھیجا منظور کر لیا اور محمد بنی خان کا شاہ کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان
میں بھیجا تجویز کیا گیا۔

خواجہ فرید الدین احمد کی محمد بنی خان سے بہی دوستی اور جبکہ وہ ہندوستان
میں بطور سفیر کے بھیجا تجویز ہوا تو محمد بنی خان نے بہت زیادہ راہ و رسم خواجہ فرید الدین
سے بڑھائی تھی۔ محمد بنی خان کی سفارت ہندوستان کا مفصل حال تاریخ سفارت
حاجی خلیل خان محمد بنی خان مطبوعہ ممبئی میں مندرج ہے محمد بنی خان کو شعر کا بھی اثر
تھا۔ اوسکی دوستی کا خواجہ فرید الدین احمد سے یہ بڑا ثبوت ہے کہ جب خواجہ فرید الدین احمد
امور سفارت کے انجام دینے کے بعد شیراز سے بوشہر کو روانہ ہوئی گئے تو محمد بنی خان
نے چند اشعار الوداعی بطور علامت دوستی کے تصنیف کر کے خواجہ فرید الدین احمد کو پیش
کیے۔ وہ اشعار ہمراہ دیگر اشعار محمد بنی خان کے تاریخ سفارت مذکورہ بالا میں بصفحہ ۱۰۳
چھاپے ہوئے ہیں جنکو ہم تلفظ مع اوس عبارت کے جواو کے عنوان پر لکھی ہے ذیل
میں مندرج کرتے ہیں۔

قطعہ کہ خواجہ فرید الدین احمد در شب و انگلی ایشان از شیراز بہ بندر الہوشہ بدہیمہ نوشتہ شد

مشققا شب چو زلفِ گلرخان	خاطر جمع پریشان گشتہ است
حیرت افزا دید مرا از خوشنیتن	کنز چہ رواحوالہ مینان گشتہ است
خاکدانِ دھسر راز اب و ہوا	آتش گویِ فروزان گشتہ است
بردلم نہ از گلے خارے خلید	تا بگویم اینم از آن گشتہ است
ہم یک مشب بندہ دھسر و زار	دل ترا از جان چہ خواہان گشتہ است
ہجر تو بس مشکل آید بر سفیر	از چہ رو پیش تو آسان گشتہ است

اس سفارت کے انجام دینے کے بعد خواجہ فرید الدین احمد ہوشہ سے کلکتہ واپس آئے
اوس وقت کوئی پولیٹیکل امر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اور واقع برہامین پریش تھا۔
اوسکے طے کرنے کو خواجہ فرید الدین احمد گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے بطور ہجرت مقرر
ہو کر اوامین گئے اور اوسکو انجام دیکر یہ کلکتہ میں واپس آئے۔

اوکی واپسی کے تھوڑے عرصہ پیشتر یعنی سنہ ۱۲۸۷ھ مطابق سنہ ۱۸۷۱ء ہجری میں
ملک بونیل کنڈ فتح ہو چکا تھا اور واسطے وصول مالگزاری کے وہ کی تحصیلدار بننا
تقرر ہوا تھا۔ اوس زمانہ میں عہدہ نہایت معزز اور ذی اختیار تھا۔ اوتن تحصیلداروں
کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ ایک حصہ ملک کا سپرد ہو جاتا تھا اور جس قدر روپیہ دوس

ملک سے مالگزارسی کا وصول کرتے تھے دس روپیہ سیکڑا حق تحصیل اور مین سے لیتے تھے۔ خواجہ فرید الدین احمد اواسے واپس آنے پر بوندیل کسٹمیں اوس عہدہ پر مقرر ہوئے اور پرگنات اوگاسی وغیرہ جواب ضلع باندہ میں شامل ہیں اوکے سپرد ہو گئے۔ جب یہ انتظام شکست ہو گیا اور کلکٹر اور معمولی تحصیلدار مقرر ہوئے اوس وقت خواجہ فرید الدین احمد اوس عہدہ سے کنارہ کش ہو کر دلی میں واپس آئے۔

خواجہ فرید الدین احمد ۱۱۸۱ھ ہجری مطابق ۱۷۶۷ء کے دلی سے نکلے تھے اور ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۷ء کے بارہ تیرہ برس کے بعد واپس آئے۔ اس عرصہ میں دلی میں بہت واقعات گزر چکے تھے۔

جب وہ گئے تو شاہ عالم بادشاہ تھے اوکی انکمیں نخل حکیم تھیں اور اوکی حالت نہایت خستہ اور خراب تھی۔ اونہوں نے اپنی خستہ حالی کے بیان میں ایک غزل لکھی ہے اور ہر ایک سے اوزینز انگریزوں سے مدد چاہی ہے۔ ہم او غزل کو بطور تاریخانہ یادگار کے اس مقام پر لکھتے ہیں۔ یہ غزل مفتاح التواریخ مولفہ ولیمہ مین ہی چپی ہے۔ مگر نہایت غلط چپی ہے۔ ہم اوسکو صحیح کی ہوئی چباتے ہیں اور جو اشارات اوس غزل میں ہیں حاشیہ پر اوسکی تصریح بھی لکھ دیتے ہیں۔ وہ غزل یہ ہے۔

صبرِ حادثہ برخواست پی خواری ما	داد برباد سرو برگ جہان داری ما
آفتابِ فلکِ نفعتِ شاہی بودیم	برودر شامِ زوال آہ سیکاری ما

چشم ما کنده شد از دست فلک بشیر
 و ادا افغان بجه شکست شاهی پیا
 بود جانگاه زرو مال جهان همچو من
 کرده بودیم گناهی که نرانش دیکم
 کرده سی سال نظارت که مراد و بیا
 عهد و پیمان بمیان داده نمودند و غا
 شیه و آدم افغی بحسب ابر و دم
 حق طفلان که سبی سال فرا هم کردیم
 قوم مغلیه افغان هم با بی دادند
 این گذاراده همان که بدوزخ برو
 گل محمد که زمره آن بشر است گشت
 آن نیاز زود سلیمان بدل بیک لعین
 شاه تیمور که دارد سر نسبت با من
 ما و هوجی سیند بهیة فرزند بگریخت
 اصف الدوله و انگریز که دستور اند
 راجه و راو و زمیندار امیر و چه فقیر
 از نینان پر پیچیده که همدم بودند

تا نبینیم که کند غیر چه سازداری ما
 کیست جز ذات مبر که کند یاری ما
 دفع از فضل الهی شده بیماری ما
 هست امید که بخشد گنه گاری ما
 زود تر یافته پادشاهش ستم گاری ما
 مخلصان خوب نمودند و فاداری ما
 عاقبت گشت مجوز بگریختاری ما
 کرده تا راج و نمودند سبکباری ما
 بسکه گشتند مجوز بگریختاری ما
 بانی جور و ستم شد بدل افکاری ما
 چه قدر کرد و کالت پی آزاری ما
 هر سه بستند که مبر گرفتاری ما
 زود باشد که بیاید بعد دگاری ما
 هست مصروف تلافی ستم گاری ما
 چه عجب گر بنایند مد و گاری ما
 حیث باشد که نسا زنده بغضاری ما
 نیست جز محل مبارک به پستاری ما

گرچہ ما از فلک امر و حوادث بدیم باز فدا دھدایز دسر سزاری ما

اس عرصہ میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء مطابق سنہ ۱۲۱۹ ہجری کے لارڈ لیک نے دلی کو فتح کر لیا اور انگریزی عملداری دلی میں ہو گئی اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو دلی کا نظام جنرل اختر کوئی کے سپرد کیا گیا۔ جنرل اختر کوئی بطور رزیدنٹ کے وہاں تھے اور کرنل برن بطور اعلیٰ افسر فوج کے۔ لارڈ لیک مرہٹوں کے مقابلہ میں مصروف تھے۔ ہو لکر نے ۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو نواح شہر امین لارڈ لیک سے شکست پائی اور دہلی کی طرف چلا۔ اور ۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو دہلی کی فسیل کے تلے پیادوں اور سواروں کی فوج اور سوتوپین لیکر آگے بڑھا۔ اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ایک میرے مغربزرگ جوا وسو قت میں جوان تھے مجھے کہتے تھے کہ انہوں نے دہلی کی فسیل پر چڑھ کر ہو لکر کی فوج کو دیکھا۔ ایک لہڑا ہوا دریا سواروں کی فوج کا معلوم ہوتا تھا۔ اور یقین نہیں ہوتا تھا کہ دلی کے اندر جو قبیل فوج ہے وہ دلی کو بچا سکے گی اور اس فوج کو شکست دی۔ جنرل اختر کوئی کو اس بات کی خبر پہنچ گئی تھی کہ ہو لکر کا ارادہ دلی پر آنیکا ہے انہوں نے نہایت دشمندی سے اس کا کافی بندوبست کیا تھا۔ کرنل برن کو مدد فوج کے سہارنپور سے بلایا تھا۔ اور دولت او والی پٹن جو زیر کمان کپتان سیرٹ کے ساتھ تھے اور پنجیبوں کی پٹن کو جو زیر حکم لفٹنٹ برج کے پانی پت میں تھے دلی میں جمع کر لیا تھا۔ ہو لکر نے ۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء مطابق سنہ ۱۲۱۹ ہجری کے دلی پر حملہ کیا۔ دہلی کی فوج نے گولہ باری شروع کی۔ کئی دن لڑائی رہی اور ہو لکر کو شکست ہوئی اور ہٹا گیا۔

وہی میرے دوست کہتے تھے کہ ہولکر کے بھاگ جانے کے بعد میدان صاف ہو گیا
تعب آتا تھا کہ ہولکر کی اس قدر کثیر فوج کہاں غائب ہو گئی۔ اور کون اسکو کہا گیا۔ پاشا
نے جنرل اختر لوہی کو نصیر الدولہ معز الملک فاوار خان بہادر ظفر جنگ کا خطاب عنایت فرمایا
اوسکے بعد شاہ عالم ۳ رمضان ۱۲۱۸ھ ہجری مطابق ۱۸ دسمبر ۱۷۸۳ء کے
مر گئے اور اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایک سخت واقعہ پیش آیا۔ نواب ممتاز محل فیوج اکبر شاہ کی
نہایت چاہیتی ہوئی اور مرزا جہانگیر اور مرزا بابا برکی مان تھیں یہ بات چاہی کہ مرزا ابوالظفر
عرف مرزا ابن جو سب سے بڑے بیٹے پادشاہ کے تھے اور جو اخیر کو بہادر شاہ ہو
ولی عہد نہ بنائے جاویں۔ بلکہ مرزا جہانگیر ولیعہد ہوں پادشاہ بھی بنی چاہیتی ہوئی
کی مرضی کے تابع تھے مگر حکام انگریزی اسکو جائز نہیں رکھتے تھے۔ مرزا جہانگیر نے
فساد کرنا چاہا اور قلعہ میں کچھ مسلح آدمی جمع کیے۔ اوس زمانہ میں سٹریٹن ریڈنٹ
تھے وہ مرزا جہانگیر کے سہجائے کو قلعہ میں گئے۔ مرزا جہانگیر نے اون پر پتھر پھینکی گولی
چلائی۔ وہ بچ گئے اور اونکی ٹوپی میں گولی لگی۔ وہ واپس آئے اور مرزا جہانگیر نے
قلعہ کے دروازے بند کر لیے۔ سٹریٹن ریڈنٹ تھوڑی سی فوج لیکر گئے۔ قلعہ کا دروازہ
اوکھاڑ کر اندر گھس گئے اور مرزا جہانگیر کو گرفتار کر کے قلعہ الہ آباد میں رہنے کے لیے واپس
کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸ دسمبر ۱۲۱۸ھ ہجری کے وقوع میں آیا۔ اوسوقت مرزا جہانگیر
کی عمر انیس یا بیس برس کی تھی اور اوسنی مانہ سے قلعہ کے دروازوں پر ایک کپنی انگریز

فوج کی متعین ہو گئی اور ایک کپتان قلعہ کے لاہوری مروازہ پر رہنے لگا۔ مزار جمالیہ کا انتقال ۱۲۸۶ء مطابق ۱۲۳۶ھ ہجری کے الہ آباد میں ہوا۔ اول دفنی لاش خضر باغ میں دفن ہوئی۔ پہرہ کی مین لائی گئی۔ جس کا ذکر ہم آئندہ لکھیں گے۔

جب یہ واقعہ ہوا لارڈ منٹو گورنر جنرل تھے اور اکبر شاہ کی متعدد خوشنیتیں اپنی شناخت اور اختیارات کے لارڈ منٹو کے سامنے پیش تھیں۔ مگر اس واقعہ کے بعد لارڈ منٹو نے سب کو نا منظور کیا اور صرف چہتر نزار پانسو روپیہ لاہوری جس کا اقرار لارڈ ولزلی نے کیا تھا بطور ریشن کے مقرر کر دیا۔ جس کا اضافہ ایک لاکھ روپیہ لاہوری تک ہو گیا۔ بہادر شاہ کے وقت میں سو لاکھ تک اضافہ کی تجویز ہوئی تھی مگر وہ جاری نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ اضافہ کا روپیہ ہی بادشاہی خزانہ میں آگیا تھا۔ پہرہ واپس کر لیا گیا۔

خواجہ فرید الدین احمد بونڈیل کمنڈ سے واپس آنے کے بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔ اونسکے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک سالہ سہمی و تحفہ نعمانیہ، صنعت صطرباب میں ہمارے پاس موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۸۶ھ ہجری مطابق ۱۸۶۵ء کے کلکتہ میں تھے۔ چنانچہ عبارت خاتمہ تحریر رسالہ مذکور یہ ہے۔ و تمت الرسالة جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ ہجری در کلکتہ فرید، مگر یہ معلوم نہیں ہوگا کہ کس سنہ میں دلی سے کلکتہ میں گئے تھے۔ اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی حال تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعہ کے نو محلے میں رہتے تھے لاہوری روپیہ نہیں ملتا تھا

اور وہ چستون پر چڑھ کر چلائے تھے کہ بہو کے مرتے ہیں بہو کے مرتے ہیں۔
 اکبر شاہ کے عہد میں بھی یہی باتری تھی۔ خرچ آمدنی سے بہت زیادہ تھا۔ قرضہ ہو گیا
 تھا اور تنخواہیں ملازمین اور شاہزادوں کی دودھ مہینے تین تین مہینے تک نہیں تقسیم ہوتی تھیں
 اکبر شاہ کو ان خرابیوں کے رفع ہونے کی نہایت فکر تھی اور اس بات کا بھی خیال تھا کہ لی
 اور اس کے مفصلات میں خالص بادشاہ کی حکمرانی رہنی چاہیے اور انگریزوں کو مصل
 ملک سے تین لاکھ روپیہ ہوارسی دینا لازم ہے۔

سید محمد تقی خان بن جواد الدولہ جواد علی خان مولف اس سالہ کے والد اور خواجہ ریلکلیہ احمد
 کے اماد کو دربار شاہی میں نشینی سے معزف تھا اور اکبر شاہ سے اونکے مانہ شاہزادگی سے بہت
 زیادہ راہ و رسم تھی۔ اور بادشاہ کبھی کبھی اونکو بہائی تقی لکھ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔
 اکبر شاہ نے سید محمد تقی سے چاہا کہ وہ انتظام امور بادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اور ان
 خرابیوں کا انتظام کریں۔ سید محمد تقی نے تو اس سے عذر کیا۔ مگر اپنے خسر خواجہ
 فرید الدین احمد کا اور اونکی سفارت ایران اور اونکی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دہی کہ اونکو
 بلایا کر وزیر کیا جائے تو غالباً سب امور کا انتظام ہو جائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو
 پسند کیا اور خواجہ فرید الدین احمد کو کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا اور وہ کلکتہ سے اسی سال یعنی
 ۱۰۳۱ھ ہجری مطابق ۱۶۲۱ء کے دلی میں آئے۔ بادشاہ کی ملازمت کی۔
 اکبر شاہ نے اون کو وزیر مقرر کیا۔ خلعت وزارت اور خطاب بے الدولہ اس ملک
 مصلح جنگ کا عطا کیا۔

خواجہ فرید الدین احمد نے اپنے ایام وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ قرضہ نہ ہو گئے تھے قرضہ ادا کرنے اور اخراجات برابر کرنے کی تین تدبیریں کیں۔ تمام ہنگامہ و بیگناہات و ملازمان و عملہ شاہی کی تنخواہوں سے دس روپیہ فیصدی تنخواہ کم کر دی اور مبلغ یعنی شاہی باورچیخانے جو بڑے خاصہ، اور چھوٹے خاصہ، کے نام سے موسوم تھے اور جب کاروانہ صرف کثیر تھا اور اسی کے ساتھ بعض دیگر غیر ضروری کارخانجات کو موقوف کر دیا اور تیسرا کام یہ کیا کہ دیوان عام کی چھت حسین تانبے کی موٹی چادریں بطور چھت گیری کے لگا کر اوپر پتیل کی ڈنڈیوں و پہلوئوں سے جن سبز چادریں بطور خاتم بندی کے بنائی گئی تھیں اور جسکو بعد شاہ عالم ۳۷۱ھ ہجری مطابق ۱۵۵۹ء کے بہادر مرہٹوں نے اکھاڑا لیا اور لے نہ جاسکا تھا اور وہ سب اکٹری ہوئی پڑی تھیں اور پہلوئوں کا بنانا بنظر حالات شاہی غیر ممکن تھا اور سکا سونا الگ اور تروا لیا اور جب قدرتا بنانا تھا شاہی ٹکسال میں اس کے پیسے بٹا ڈالے (غدر سے پہلے تک یہ پیسے دلی میں مروج تھے) اور پتیل فروخت کر دیا اور اس سے ۱۵ لاکھ خاصہ کمانا کملا تا تھا جو تمام ملازمین اور عمدہ داروں اور خواصوں اور باری داروں کو جو کچا پہرہ کو دن رات اپنی اپنی باری سے دیوان خاص اور خاص ڈیوڑھی اور دیگر مقامات خاص میں حاضر رہتے تھے بادشاہ کی طرف سے تیار ہو کر دیا جاتا تھا۔ ۱۲

۱۵ چھوٹا خاصہ وہ کمانا کملا تا تھا جو تیار ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور بڑے بڑے امیر یا حکیم جو اپنی اپنی باری یا کسی ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے انکو بھیجا جاتا تھا۔ ۱۲

کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور
 تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا۔ مگر شانہ زورے اور بیگیاں اور درباری سب
 اس بات سے کہ انکی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں نہایت ناراض تھے اور خاصوں اور
 کارخانجات کی موقوفی عام شکایت کا باعث تھی۔ ان اسباب سے شخص نے
 پادشاہ کے پاس شکایتیں شروع کیں۔ دیوان عام کی جہت کی نسبت جو کچھ کیا گیا تھا
 وہ پادشاہ کی اجازت اور مرضی سے کیا گیا تھا۔ مگر تمام لوگ چرچا کرتے تھے کہ
 دیوان خاص کی چاندی کی چہت پادشاہ نے لوٹ لی اور دیوان عام کی تانبے
 کی چہت خواجہ فرید نے۔ رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر پادشاہ کے دل پہ بھی ہوا اور
 دبیر الدولہ نے عہدہ وزارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر مناسب نہ جانا۔ یہ کہ وہ زیادہ پہلے
 ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اس عہدہ سے استعفا دیا اور چند روز بعد پہر
 کلکتہ کو چلے گئے۔

ان کے بعد تمام اختیارات وزارت نواب ممتاز محل کے جو پادشاہ یکم تین قبضہ اقتدار میں
 چلے گئے اور انہیں کی طرف سے مختلف اشخاص وزارت کا کام انجام دیتے تھے۔
 ان واقعات کے چند روز بعد پادشاہ نے پہر واسطے اضافہ پیکش کے تحریک
 کرنی چاہی اور اس باب میں ایک مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا جس میں زیادہ تر شکایات
 اس بات کی تھیں کہ آمدنی واسطے اخراجات ضروری کے کافی نہیں ہے۔ سید محمد تقی نے
 نے موقع پا کر پادشاہ سے عرض کیا کہ دبیر الدولہ کلکتہ میں موجود ہے اور آمدنی اور اخراجات

کا حال اونکو معلوم ہے اور کاغذات جمع خراج کی یاد دہشتین ہی اونسکے پاس ہیں اور حقیقت آمدنی و خرچ برابر ہو گیا ہے اور قرضہ ہی ادا ہو گیا ہے۔ اگر گورنر جنرل اونسے دریافت کرے تو بجز اسکے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بالفعل آمدنی اور خرچ برابر ہے۔ قرضہ ہی نہیں ہے اوس وقت جو مراسلہ کا بیہیجا تجویز کیا گیا ہے وہ کیونکر تسلیم ہو سکیگا بادشاہ کے دل میں اس بات نے جگہ کی اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو مگر اسکی تدبیر کیا ہے۔ سید محمد تقی خان نے عرض کیا کہ خواجہ فرید کا علیحدہ کر دینا مصلحت نہیں رہتا۔ اگر اس میں کچھ سعی و کوشش ہو سکے گی تو دبیر الدولہ ہی کی تدبیر و کوشش سے ہو سکیگی۔ بادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنیکے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیر الدولہ کے کلکتہ سے بلانے کو حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۵ھ ہجری مطابق ۱۹۱۹ء کے بدستور اپنے عہدہ سابق پر مامور ہوئے۔

اس دفعہ کے تقرر میں ہی نواب دبیر الدولہ نے درحقیقت ماہواری منشن کے ضمان کی جو بنام ٹپکیش، بادشاہ کے لیے مقرر تھی کوی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ لیٹ لٹل کرتے رہے جسکے سبب سے بادشاہ کی کبیدگی خاطر پڑھتی جاتی تھی۔ جو لوگ اونسکے مخالف تھے انہوں نے بادشاہ کے دل میں یہ بات جمائی کہ دبیر الدولہ انگریزوں سے سازش کرتے ہیں اور اسلیئے اوس میں کوشش نہیں کرتے اور لوگوں کو بھی تعجب تھا کہ وہ کیوں اس میں تساہل کرتے جاتے ہیں آخر کار بادشاہ نے یہ بات چاہی کہ وزارت کے کام میں اور شخصوں کو بھی دبیر الدولہ کے شریک کیا جاوے۔ اس شرارت کے تین

شخص خواہاں ہوے۔ ایک نواب محمد میر خان جنکے باپ شاہ جامی دکن مانہ میں دہلی کے صوبہ
 جب کمپنی انگریز نے دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ دوسرے اجہ کیدار ناتھ اور تیسرے اجہ جی سکھہ
 یہ واقعہ جولائی ۱۸۵۷ء کا ہے جو مطابق ۱۲۳۶ھ کے (واضح ہو کہ اس واقعہ کا سال
 ہملو جنرل گارڈن کے وزیرانچہ سے جو انکی خاندان میں محفوظ ہے اور جو کاسکین ضلع ایٹمین
 ہے دستیاب ہوا ہے) مگر نواب ممتاز محل اجہ جی سکھہ راسی کی طرفدار تھیں اور وہ چاہتے تھیں
 کہ سب کو نکال کر اجہ جی سکھہ راسی کو مقرر کیا جاوے۔ بدیر الدولہ انکی شرکت میں کام کرنا منظور
 کرتے تھے چند وزیر سطح فقرہ بازیاں اور بدیسرین ہیں آخر کار بصلاح جنرل اکٹر لونی کی جو زبرد
 تہ اور بدیر الدولہ سے نہایت دوستی رکھتے تھے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۲۳۷ھ ہجری کے بدیر الدولہ نے
 استعفا دیدیا۔ اس فوج غالباً تین برس یا ساڑھے تین برس تک انہوں نے وزارت کا کام انجام دیا۔
 اوس زمانہ کی ایک عمدہ یادگار ایک تصویر کا فوٹو گراف ہماری پاس موجود ہے جو مانہ وزارت بدیر الدولہ
 میں بادشاہی مصوون نے اکبر شاہ کے دربار کی بنائی تھی۔ اور یہ تصویر اوس کتاب میں بھی چھاپی گئی
 ہے جسکو مولوی سیاح احمد خان دہلی کو مصنف نے تصنیف کیا ہے اور بزم آخر جب کا نام ہے۔
 اس میں شاہزادوں اور امراء کو دو گروہوں میں جو بادشاہ کے ویرد کے ہیں و شکلیں جنرل اکٹر لونی
 اور وزیر اعظم خیر الدین احمد کی ہیں جو برابر کمرے میں جنرل پوری پٹشاک پہنے ڈی ٹی رکے
 جریب یا عصا معزت پر جبکہ ہوئے ہیں وزیر اعظم کے پاس ہی جریب ہی۔ یہ تصویر جن کے دربار کی
 ۱۲۳۷ھ جریب کا ملنا بادشاہی دربار میں تفرزاد و تقریب کی علامت تھی۔ دربار میں کمرے رہنے کے لیے
 سہارے کے واسطے عصا ملتا تھا کیونکہ دربار شاہی میں جملہ حاضرین ہر قسم کو کمرہ ہنٹا پڑتا تھا۔ ۱۲

جو یوں خاص میں ہوتا تھا دیوان عام کا دربار بہت نون سے موقوف ہو چکا تھا۔ بادشاہ تخت طاؤس پر بیٹھے ہوئے ہیں جو اصل تخت طاؤس شاہجہانی کی نقل بنایا گیا تھا۔

جنرل کٹرلونی اور وزیر اعظم دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد مین ٹربی وستی تھی جنرل کٹرلونی اکثر دبیر الدولہ پاس جب چاہتے آیا کرتے تھے۔ اور اس لیے دبیر الدولہ کی مسند کے پاس ہمیشہ ایک نہایت عمدہ لال محل کی آرام کرسی کسی ریتی تھی کہ جب وقت بیوقت جنرل صاحب آئین تو اس پر بیٹھتے۔ دبیر الدولہ اپنی مسند پر اور جنرل کٹرلونی اس کرسی پر بیٹھتے تھے۔

ایک دن جنرل کٹرلونی آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً راقم کسی سبب سے ہان گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انہوں نے بلالیا اور کچھ بات کی راقم نے جنرل سے جو فل ڈریس پوری پوشاک یا وردی پہنے ہوئے تھے پوچھا کہ وہ آپ نے ٹوپی مین کریوین لگا رکھے ہیں اور کوٹ مین دوہرے بٹن کیوں لگائیے ہیں، جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ اس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس کی ہو گئی۔ دبیر الدولہ کے استغفے کے بعد راجہ جی سکھ اسے زیادہ محیط ہو گئے اور کارکنان سلطنت نے بادشاہ کے مقاصد پورا ہونے کو زیادہ تدبیر کرنی چاہی جو محض

اسی یہ تخت طاؤس ہوتا تھا اصل تخت طاؤس کے بادشاہ کے زمانہ میں لٹ جانے کے بعد محمد شاہ کے وقت میں بنایا گیا تھا۔ نہایت خوبصورت تخت تھا اور بالکل شاہجہان کے تخت کی نقل تھا اگر کراچی کا تھا اور نگینہ جو بجائے جواہرات جڑے گئے تھے وہ بھی اصلی نہ تھے۔ بہادر شاہ نے اپنے زمانہ سلطنت میں ایک دوسرے تخت چاندی کا بنوایا تھا۔ ۱۲

نادانی کا کام تھا۔ یعنی انہوں نے رام موہن رائے کو جو کلکتہ کے ایک بابو اور تہنہ لائق اور ذی علم اور متین۔ مہذب بااخلاق تھے اور وہی برہما سماج مذہب کے جو بے بنگالیوں میں نہایت کثرت سے رائج ہے بانی بن لایا۔ اس ارادہ سے کہ بادشاہ کی طرف سے وکیل کر کے لندن بھیجا جاوے۔ چنانچہ وہ دلی میں آئے اور بادشاہ کی ملازمت کی اور انکو راجہ کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور آخر کار وہ بادشاہ کے وکیل ہو کر لندن میں بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۸ھ کے لندن پہونچے اور ۱۸۳۲ء مطابق ۱۲۴۹ھ ہجری کے مہینہ مریگیے (راقم نے انکو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا ہے اور دلی کے لوگ یقین کرتے تھے کہ انکو مذہب اسلام کی نسبت زیادہ رجحان ظاہری مگر اس کارروائی سے ہی مقصد حاصل نہوا۔ بہادر شاہ کے عہد میں ہی اس باب میں کوشش کی گئی اور حکیم حسن احمد خان صاحب جو بادشاہی امور کے کارکن تھے خود کلکتہ گئے اور وہاں سے ایک انگریز کو اپنے ساتھ لائے اور بادشاہ کی طرف سے اسکو وکیل کر کے لندن کو روانہ کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہوا۔

اس ناکامی کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم اور لارڈ لیک سے جو اقرار اور معاہدے ہوئے تھے اوسکے برخلاف شاہ عالم نے کوئی شق مہٹوں کے نام لکھا تھا جبکہ مہٹوں اور لارڈ لیک میں لڑائی ہو رہی تھی۔ وہ شق لارڈ لیک کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اس سبب سے جو معاہدے کہ لارڈ لیک نے اوسکے قبل شاہ عالم

کیے تھے ہسب اکل اور ساقط ہو گئے تھے اور اس لیے حقیقت شاہ عالم اور کمپنی انگریزین کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا تھا اور کمپنی انگریز کو اختیار کلی حاصل تھا کہ بادشاہ اور خاندان شاہی کے ساتھ بلحاظ مصلحت ملکی جس طرح پرچاہے کر دیا کرے۔ اگرچہ انگریزوں نے اسکو علانیہ ظاہر نہیں کیا۔ مگر یہی وجہ تھی کہ تمام دستوں اور خواہشیں بادشاہ کی جو بر بنائے عہد اور مذاق لارڈ کلک کے تھیں اور پھر کچھ لطف نہیں ہوتا تھا۔

وزارت سے استعفا دینے کے بعد مہاراجہ بنجیت سنگھ نے اپنے مقصد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ و بیرالدو لے کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں۔ مگر انکی بڑی بیٹی یعنی والدہ راقم نے کہا کہ خدا آپ کو اس قدر دیا جو کہ جس طرح پرچاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جاوے تو بھی جو آرام و آسائش آپ کو اب ہے اس میں کچھ نہ یادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور میں جانا اور مہاراجہ بنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کا انگریزوں کی عملداری میں ہنا اچھا نہیں ہے معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آویں اور کیا انقلابات ہوں۔ اور کس قسم کی مشکلات پیش آجاویں۔ پس اس مایہ ضعیفی میں کہ کبھی طبیعت ہی علیل رہتی ہے ہاں جاننا میں پسند نہیں کرتی و بیرالدو لے کے دلپس بات نے کیا کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا اور پہر اخیر عمر تک باوجود کم ہر بادشاہ کی طرف سے ایک دفعہ تحریک ہوئی مگر کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

غرض کہ خواجہ فرید الدین احمد نے ایسی خوش زندگی بسر کر کے ۱۷ محرم ۷۸۸ھ بمطابق ۱۲۸۶ء کے انتقال کیا۔ بیرون ترکمان دروازہ چونسٹھ کنبہ میں جو ایک سو تیس شاہ فدا حسین کا تہادفن کیے گئے۔ اونکی قبر پر نہایت عمدہ و نفیس عمارت بنائی گئی۔ اونکے بیٹوں نے اونکی رسم سوم و چہلم میں ہزار ہاروپہ خرچ کیا۔ اونکے فرار پر پچاس سال تک بست چڑھتی تھی اور ایسا عمدہ و نفیس میلہ بسبب قرب شہر کے ہوتا تھا کہ تمام درگاہوں میں جو بستیتیں ہوتی تھیں سب بات ہو گئی تھیں۔

اونکے چھوٹے بیٹے ٹوٹ بن العابدین خان نے مادہ تاریخ وفات ماہِ شمس یافتہ نکالا اور اوسکو بطور قطعہ کے موزون بھی کیا تھا جو رقم کو یاد نہیں ہا۔ زمانہ تحریر اس سال میں یعنی ۲۵ اگست ۱۸۹۳ء کو میں نے اوسکا ذکر مولانا خواجہ الطاف حالی سے کیا انہوں نے اوس مادہ تاریخ کو اس طرح پر موزون کر دیا۔

رخت سفر چار جہان خواجہ فرید الدین بہت	از بی سال حلتش سوی بسوشت تمام
روی نمود ناگمان خواجہ شبی بخواب	دید و بخندہ باز گفت ،، جا بہشت یافتہ

اونکے انتقال کو کئی دن بعد مسٹر کول بروک جو اوس زمانہ میں دہلی میں رزٹنٹ تھے اور مسٹر ٹولکین جو اسٹنٹ رزٹنٹ تھے بطور ماتمیہ سی کے آئے۔ اوقت دبیر الدولہ کے بیٹے اور داماد اور پوتے اور لوناسے سب موجود تھے۔ اون سبکو مخاطب کر کے کلمات تعزیت کہے اور بذریعہ پیغام کے کلمات مجلس میں اونکی لڑکھ کو کھلا بھیجے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ جو اسوقت موجود تھے نہایت عمدہ و

پیش آئے اور دبیر الدولہ کی وفات پر نہایت تاسف ظاہر کیا۔

نواب دبیر الدولہ نے نہایت عمدگی و خوبی و شان و شوکت امیری نام آوری میں آخر عمر تک اپنی زندگی بسر کی۔ تمام و سوا اور امر اور شرفائے شہر اور کائنات ادب و لغت کر دے تھے۔ اس کے مزاج میں بہت زیادہ نفاس تھی۔ جس قدر اور نکال لباس فرشتہ تمام چیزیں او جلی رہتی تھیں اور نکال بیان مشکل ہے۔ علم سے اور بالخصوص ریاضیات سے بہت شوق تھا۔ اور نکال معمول تھا کہ دو تین طالب علموں کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ متعدد طالب علموں میں سے دوہیں اور سبجہ منتخب کر لیتے تھے اور اگر کوئی امداد کا مستحق ہوتا تھا اور سکا وظیفہ مقرر کر دیتے تھے۔ مولوی امت علی صاحب بن مولوی حیات علی صاحب جو دہلی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدر آباد چلے گئے اور مولوی جب علی صاحب شیعہ مذہب جنہوں نے آخر کو پنجاب میں نہایت عروج پایا اور خواجہ محمد ناصر جان جو بنی خواجہ محمد نصیر کے سجادہ نشین حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ ہوئے اور حکیم ستم علی خان اور ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان کے چھوٹے بیٹے نواب بن عبدالعزیز خان نے جو اپنے وقت میں علم ہدایت اور ریج دانی اور علم و صنعت آلات صدیق بنیل تھے اور انہیں سے بے علم و سیکے تھے۔ علم ریاضی گویا ہمارا خاندانی علم ہو گیا تھا۔

کتاب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ ان کے بہت بڑے کتب خانہ کی کوئی کتاب کسی قسم کی اور کسی فن کی ایسی نہ تھی جو انکی نظر سے نہ گذری ہو۔ اور نکال دستور تھا کہ جو نئی کتاب آتی تھی آبی جاتی تھی جب تک کہ وہ نہ پڑھ لیں کتب خانہ میں داخل نہ ہوتی تھی۔ اور ان کے کتب خانہ کی

کتا بونگی بڑی شناخت یہ تھی کہ اون پر کسی نہ کسی جگہ اونکے ہاتھ کا لکھا ہوا کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا حاشیہ ہوا کسی لغت کے معنی ہوں یا کسی مسئلہ کی تحقیق ہو۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے مگر اونکے کتب خانہ کی انگریزی کتابوں پر بھی کسی لفظ کے معنی لکھے ہوئے اونکے ہاتھ کے پایے جاتی تھے اور نیز بعض اور وجوہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونکو کسی نہ کسی قدر انگریزی آتی تھی کم سے کم یہ کہ بول لیتے اور پڑھ لیتے تھے۔

اونکے تصنیف کیے ہوئے متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے علم ہدیت اور آلات ہدایت میں تھے جو غدر میں ضائع ہو گئے۔ مگر اونکے تصنیف کیے ہوئے اور اونکے ہاتھ کے لکھے ہوئے تین رسالے ایک صنعت صطراب کا دوسرا صنعت پرکار مناسب کا اور تیسرا اعمال پرکار مناسب کا بغایت وزیر الدولہ بدرالملک خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر سی آئی ایسی وزیر عظم ریاست پٹالہ ہکو دستیاب ہوئے ہیں جنکو ہم نے کتب خانہ مدرستہ العلوم میں نقل کر دیا ہے۔ خدا کرے صد ہا سال تک اس کتب خانہ میں محفوظ رہیں۔

نواب بیرالدولہ کی مجلس ایسی مودب اور شایستہ ہوتی تھی کہ جس میں جا کر ایک عظمت و شان معلوم ہوتی تھی۔ تمام لوگ نہایت ادب و رشایتگی سے خاموش بیٹھے ہوا کرتے تھے کوئی فضول بات بچہ کام کی باتوں کے یا کسی علمی مسئلہ کے اور بعض دفعہ تصوف کے مسائل کے اور کچھ کہ نہیں ہوتا تھا۔ بخشی الممالک بخشی محمد خان بھی جو شہزادہ ارستان کے گویا اور نہایت خوش مزاج اور ظرفیت شخص تھے وہی اونکی مجلس میں نہایت مودب رہتے تھے

اور کہتے تھے کہ میں ہندوستان میں نواب بیرالدولہ کو نہایت ادب کے لائق سمجھتا ہوں
مگر انکے بیٹوں کے ساتھ دوستانہ ملاقات رکھتے تھے اور اکثر آیا کرتے تھے اور ہر وقت
ظرافت آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔

بخشی محمود خان ایرانی نژاد تھے۔ اونکی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا جس میں
ٹ اور ڈ ہوتی تلفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب بخشی محمود خان آتے تو اکثر ہم ٹوکوں کو
جو پوئے اور لوٹا سے نواب بیرالدولہ کے تھو اور مکتب میں پڑھتے تھے بلواتے اور ٹوپی ٹوپی
کی مشرباد کر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمایش کرتے۔ جب وہ پوری طرح پر تلفظ نہوتا
تو اس لڑکے کی ٹوپی لے لیتے لڑکے بھی اونسے ہندوستانی لفظوں کی فرمایش کرتے
ٹو بہر دو تانے فقیر کا تلفظ اون سے نہیں ہو سکتا تھا ہمیشہ تو یالٹا کہتے تھے۔ لڑکے
مشرباد جیت جاتے اور اونکی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے
بھی اونکی ٹوپی نہ دیتے غرض کہ بخشی محمود خان نہایت خوش مزاج اور نظریں آدمی تھے۔
بادشاہ کے دربار میں نہایت خوش بیانی سے جموئے سچے قصے بیان کرتے تھے۔
جب بادشاہ اونسے ہم کلام ہوتے تھے تو ایسے مصرعون ہو جاتے تھے کہ کسی دوسرے
کو کلام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ با این ہمہ نواب بیرالدولہ کی مجلس میں نہایت ہی سکنت
اور مودوب رہتے تھے۔

نواب بیرالدولہ کا معمول تھا کہ صبح کا کمانا مجلس میں جا کر لیتے تھے۔ ایک بہت بڑے
نعمت خانے میں بہت وسیع دسترخوان بچھا ہوا ہوتا تھا اور کل بیٹے اور بیٹیاں اور بچو

اور پوتیاں۔ نواسے اور نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں اور چھوٹے و بڑے سب انکو
ساتھ کھاتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے آگے خالی کابیان ہوتی تھیں اور وہ ہر ایک
سے پوچھتے تھے کہ کونسی چیز کھاؤ گے۔ جب وہ بتاتا تو اسکے آگے خالی کابی مین
اپنے ہاتھ سے وہی چیز چھپے سے اٹھا کر بقدر مناسب عنایت فرماتے تھے۔ تمام
لڑکے نہایت ادب و صفائی سے اونکے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بڑی احتیاط تھی
تھی کہ کوئی خیر کرنے نپاؤے اور زیادہ ہاتھ کھانے میں بہرے نپاویں۔ نواں حیا بنے
کی آواز منہ سے نکلنے نپاؤے۔

رات کا کھانا وہ باہر یوانستانے میں کھاتے تھے۔ زمانہ ہو جاتا تھا۔ انکی بڑی
بیٹی یعنی رستم کی والدہ اور چھوٹی بیٹی فخر النساء بیک کھانا کھلاتی جاتی تھیں۔
یہ وہی دستور تھا کہ شام کو چراغ جلنے کے بعد اونکے پوتے اور نواسے جو کھیتیں
پڑھتے تھے سہن سنانے جاتے تھے۔ اونکے مسند کے آگے دو سفید رنگ کے
شیشے کی فانوسیں جو موزون گین کھلاتی ہیں موم تہی سے روشن ہوئی کسی ہتھی تھیں اور
اونکے سامنے لڑکے بیٹھے تھے۔ اول مشکل یہ تھی کہ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچا
ہوا ہوتا تھا لڑکے اپنے پانوں نہایت صاف رکھتے تھے اس خوف سے کہ گین چا پنی
پر وہ بے لگ جاوے اگر اتفاق سے کسی لڑکے کے پانوں کا دھبہ لگ گیا تو نہایت
خفگی سے اوسکو ہرگا دیتے تھے کہ کتنے کیسے پانوں کیوں کھتا ہے، دوسری
مشکل یہ تھی لگ بڑے پر کسی قسم کا دھبہ یا روشنائی گری ہوئی نہ ہو۔ اگر اوسی وقت دوسرے

سفید کپڑے پہنکر جانے تو ناراض ہونے اور کہتے کہ، کیا تو چاروں کیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا کہ بدل کر آیا ہے۔“

سب لڑکے باری باری سے سبق سناتے اور جب کا سبق اچھا یاد ہوتا اور کسی قسم کی نفیس مہمانی اکثر باؤم کی خانہ ساز لوزتین ملتی تھیں اور جب کو یاد نہ آتا اور کو نہیں دیکھ جاتی تھیں اور گھر تک دیتے تھے۔ نہایت سخت اور خشکی کا لفظ جو ان کی زبان سے کسی کی نسبت نکلتا تھا وہ لفظ، بے پیر تھا۔

راقم جس زمانہ میں بوستان پڑھتا تھا حسب دستور سبق سناتے گیا اور سبق میں یہ شعر بھی تھا۔

طبع راسخہ حرفت ہر تے	وزان نیست مرطمعان راہی
----------------------	------------------------

پہلے مصرعہ کا میں نے ترجمہ کیا کہ، طبع کے تین حرف تینوں خالی، انہوں نے کہا وہونہ، میں سمجھا کہ میں نے غلط پڑھا۔ پھر غور کیا۔ پھر وہی معنی کہے۔ انہوں نے پھر ٹوکا۔ تیسری دفعہ بھی وہی معنی کہے۔ وہ خفا ہوئے اور کہا، بے سبق یاد نہیں کرتا، نہ کچھ بتا یا اور نہ مجھ کو پوچھا جس قدر مجھ کو سچ ہوا اور برابر آئنا آنکھوں سے طاری ہوئے وہ اب تک مجھ کو یاد ہے۔ بہت دیر کے بعد میں سمجھا کہ راست کے معنی میں نے سنیں کہے تھے۔ ہمارے بھائیوں نے ہم کو اور چڑایا اور کہا کہ دشمنی کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلمہ خود باید زد،۔

نواب دبیر الدولہ در حقیقت حکیم مشرب یا صوفی مذہب تھے کسی زمانہ میں مکتاشاہ

کے جو نہایت مغز چبیہ رسول شاہ جی کے تھے مرید ہوئے تھے۔ رسول شاہ بیون
 کے جو مرید تھے اونکو خواہ مخواہ یہ ضرور نہ تھا کہ تجربہ اختیار کریں اور ڈاڑھی مونچہ کا صفایا
 کر دیں بلکہ وہ بھی اونکے مریدوں میں داخل تھے جو تباہل کرتے تھے اور دنیا داروں کی سی
 زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی حال نواب دبیر لدولہ کا تھا۔ مگر دو برس قبل اپنی وفات کے
 اونکو خیال ہوا کہ ایک فہم تو اپنے مرشد کے طریقہ میں پورے طور پر داخل ہونا چاہیے۔
 حجام جو حاضر ہوا اوس سے کہا کہ ڈاڑھی مونچہ کا صفایا کر دے اوس نے اس
 نورانی اور نہایت خوبصورت ڈاڑھی اور مونچہوں کو مونڈ دیا شہر میں اسکا بڑا حیرت جیسا ہوا
 اور لوگوں نے نہایت تعجب کیا۔ مگر اونکو اسکی پروا نہ تھی۔ ایک دفعہ کے سوا پھر ڈاڑھی
 مونچہ کا صفایا نہیں کیا۔ اور جب انتقال ہوا ہے تو ڈاڑھی کسی قدر بڑھی ہو گئی تھی۔
 نواب دبیر لدولہ کے ذکر کے ساتھ اونکے نہایت قدیم اور پرانے دیوان لالہ
 ملوک چند کا ذکر نہ کرنا نہایت ناانصافی ہوگی۔ یہ اونکے بہت قدیم دیوان تھے اور
 نہایت فہمیدہ اور سنجیدہ تھے۔ نواب دبیر لدولہ کے مزاج میں بھی کسی قدر دخل تھا اور
 وقت بیوقت ہر ایک بات عرض کر سکتے تھے۔ نواب مدوح بھی اونکو بہت عزیز کہتے
 تھے۔ قبل انتقال جب نواب صاحب نے اپنی جاہل و تقسیم کی توجہ قدر رویہ اپنے
 بہائیوں کو دیا اسی قدر اس قدیم ملازم کو بھی دیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد
 لالہ ملوک چند تار و زمرگ نواب بن العابدین خان کے ملازم رہے۔ باوجودیکہ اونکے
 بیٹوں کو بہت عروج ہو گیا تھا مگر انہوں نے اپنی قدیم ملازمت کو نہیں چھوڑا تھا۔

بیرالدولہ کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ
 زین العابدین خان تھا۔ جب مرزا جہانگیر کا لاکھ آباد میں انتقال ہوا اور وہ زمانہ نواب
 بیرالدولہ کی وزارت کا تھا تو مرزا جہانگیر کی لاش لاکھ آباد سے دلی میں لائیکو خواجہ وحید الدین
 تجویز ہوئے۔ وہ لاکھ آباد گئے اور مرزا جہانگیر کی لاش وہاں سے لے آئے اور متصل مرزا
 حضرت سلطان نظام الدین مدفون ہوئے۔

اس وجہ سے نواب ممتاز محل کو وحید الدین احمد خان پر جہ سے زیادہ مہربانی ہو گئی۔
 اور کہا کرتی تھیں کہ وہ وحید الدین خان کو مرزا جہانگیر کے برابر سمجھتی ہوں، اور مرزا تیمور شاہ
 جو ایک ضعیف سن بیٹے مرزا جہانگیر کے تھے انکی گود میں آیا اور مرزا تیمور شاہ کی سرکار سجا
 مرزا جہانگیر کی سرکار کے نہایت شان و شوکت سے قائم ہوئی اور وحید الدین خان اس کے
 مختار کل مقرر ہوئے اور مختار الدولہ کا انکو خطاب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۸ ہجری مطابق
 ۱۸۲۲ء کا ہے۔ مگر اس وقت نواب بیرالدولہ بدستور وزیر تھے۔

اوسکے بعد نواب بیرالدولہ نے ہتھیار دیا اور بہت سے انقلابات سرکار بادشاہی
 میں ہوئے۔ مگر جو عروج اور رسوخ نواب مختار الدولہ کو سرکار تیمور شاہ اور نواب ممتاز محل میں
 تھا اوس میں کچھ فرق نہیں ہوا۔ نواب ممتاز محل کے انتقال کے برس ڈیڑھ برس پہلے
 کسی بات سے ناراض ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ جبکہ نواب علی نقی خان نائب تھے چند سال
 وہاں ہی نہایت عروج سے رہے۔ پھر مان سے واپس آئے اور دلی میں رہنے لگے۔
 جب غدر شاہیہ ام کے بعد دلی فتح ہوئی تو چیلوں کے کوچہ میں بعض لوگوں نے فوج انگریزی

سوی کچھ پناہ دیکھا۔ سہا ہی مکان میں گھس پڑے اور نواب مختار الدولہ کے مکان میں جہی کا ایک دروازہ چیلون کے کوچہ کی طرف تہا گھس آئے۔ اوسوقت نواب وحید الدین خان جو ضعیف ہو گئے تھے نماز عصر پڑھ رہے تھے۔ کسی سہا ہی نے عین نماز کی حالت میں اونسکے گولی ماری اور اونکا انتقال ہو گیا۔

خواجہ زین العابدین احمد اونسکے چھوٹے بیٹے نے اپنی تمام زندگی نہایت خوبی اور میری سے بسر کی اپنے والد کے مرنے کے بعد انہوں نے اپنے والد کا خطاب حاصل کر لیا کچھ پروانہ کی مگر ۶۳ھ ہجری مطابق ۱۲۳۷ء کے بہادر شاہ نے اونکو دیر الدولہ خواجہ زین العابدین احمد خان بہادر صلح جنگ کا خطاب عطا کیا اور قبل غدر ۱۲۴۲ھ اکتوبر ۱۲۵۸ء مطابق ۱۲۷۸ھ ہجری کے اونکا انتقال ہوا۔

اونکی زندگی عجیب مختلف شوقوں میں بسر ہوئی ہے۔ زانیہ تعلیم کے گزرنے اور باپ سے علم ہدیت اور ریاضیات کو پورے طور پر پڑھنے کے بعد اونکو گلانے اور بین بنگا شوق ہوا اور یہ شوق کسی کسی قدر اخیر عمر تک رہا۔

بین جواک نہایت عجیب اور عمدہ باجا ہندوستان کا ہے اوسکو خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور اوسکے تونہوں اور ٹھاٹھ میں ایسی ایجادیں کہیں تھیں کہ لوگ تعجب ہو گئے تھے۔ ٹھاٹ کے پردوں کے مقامات کی جسے سر پیدا ہوتے ہیں ہندی قاعدہ سے نسبتیں لگائی تھیں اور انہیں نسبتوں سے ڈنڈی کو تقسیم کر کے پردے بٹھا دیتے تھے۔ بین میں ٹھاٹ کے پردے موسم سے جھلے جاتے تھے۔ جب انہوں نے

اوسکی نسبتیں نکالیں تو پتیل کی کھانوں سے انکو مقامات معین پر کس دیتے تھے۔
 یہ کہ ایک ایسی ایجاد تھی کہ اگر یورپ کے کسی باجے میں اس قسم کی ایجاد ہوتی تو شاید ہمیشہ کو
 اوسکا یہ کمال یاد رہتا سا ایک زمانہ ایسا آتا تاکہ انکو بجز ان چیزوں کے شغل کے اور وطن
 توجہ نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑی نامی گویے دھرتی و خیال گانیوالے نوکر ہیں بنیدین تیا
 ہو رہی ہیں میرزا ناصر احمد جو مشہور ہیں بجانیوالے ہمت خان اور راکس خان کے نوہوں
 میں تھے مگر انکے باپ نہایت صحیح النسب سید تھے وہ آتے ہیں اور بین بختی ہواور بین بختی
 کے فن کے کمال کو دکھایا جاتا ہے۔

اوس زمانے کی بعض مجلسیں یہی قابل ادگار ہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے نشین
 ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشانہ کیا کرتے تھے۔ اوسمیں
 بڑے بڑے گویے آتے تھے۔ دھرتی و خیال گانیوالے اور میرزا ناصر احمد ہیں بجاتے
 تھے۔ نوابین العابدین خان ہوشہ جاتے تھے۔ رسم بھی بہت دفعہ اوسکے
 ساتھ اوس جلسوں میں گیا ہے۔ خواجہ محمد نصیر صاحب نہایت بزرگ مقدس تھے
 اوس زمانہ میں سجادہ نشین تھے۔

اور ایک جلسہ مگر اس جلسہ سے مختلف قسم کا ہر مہینے کی سترہویں کو ہوا کرتا تھا۔
 اسے پرانے کشن ایک مغلز رئیس اور نہایت ہی ضد اور دولت مند تھے اور اوسنی مانہ میں
 ایک طوائف جو نہایت خوش آواز اور دھرتی و خیال گانیوالے اور بین بختی
 تھی اوسکا نام جتا تھا۔ اوسنے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور اسے پرانے کشن کے گہن

پڑ گئی تھی۔ اوسکی خاطر سے وہ ہر مہینہ کی ستر ہون کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔
 مکان نہایت عمدہ فرش و فرش سے آراستہ ہوتا تھا۔ شیشہ آلات سے جو اس
 زمانہ میں مروج تھے بہت ہی عمدگی اور خوبصورتی سے سجایا جاتا تھا۔ شہر کے رئیس و
 وہ جسے اسے پران کشن سے دوستی تھی بلائیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے
 اور بہادر خان ستارن جو ستار بجانے میں پیش تھا اور میرزا ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنا
 نہیں رکھتے تھے سب جمع ہوتے تھے۔

بی جنائک کے لیے صدر کے مقابل پائین سمت میں سند تکیہ لگتا تھا اور لوگ اونکے
 آئینکا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اترتین اور اونکے پانون کے
 زیور کی آواز آتی تو لوگ زیادہ مشتاق ہوتے تھے۔ وہ نہایت متانت اور غور
 سے آکر مسند پر بیٹھتی تھیں۔ اول ہر بے خیال گاتی تھیں اور پہر بین بجاتی تھیں اور
 پہر اوٹھ کر کوٹھے پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ اونکے گانے بجانے کی نہایت تعریف
 کرتے تھے۔ نوابین العابدین خان ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے راقم بھی متعدد دفعہ
 اونکے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔

کبھی اون کو فن یا مضمی سے شوق ہوتا تھا۔ ان آلات بجز آلات رصد کے بنانی
 اور کو اکب کے رصد کرنے کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ جو کہ خود بہت بڑے سکھاتر
 تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ نہایت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی
 اصطرلاب اپنے ہاتھ سے ایسا عمدہ بنایا تھا جو عجائب و زکات سے تھا۔

اسکے سوا بہت سے آلات مثل ذرات کھلتیں اور ذرات کھلق۔ رنج مجیب۔ رنج غم۔
ہلزون۔ جریب الساعۃ۔ مقیاس الساعۃ اقلی و افاتی۔ پرکار تقسیم۔ پرکار متناسبہ
اور سطح جہ نقیل کے آلات اور آلات صد برجندی کے تمام نمونے خود انکے ہاتھ کے
بنائے ہوئے تھے۔ اولکادہ کمرہ جہین یہ آلات رکھے جاتے تھے ایک صد خانہ
معلوم ہوتا تھا۔

کسی زمانہ میں اونکو تینگ بازی کا شوق ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بجز اسکے اور
کسی چیز کا چرچا نہ رہتا۔ اپنے ہاتھ سے تینگ بناتے تھے اور خود لڑتے تھے
تینگ بنانے کو بھی انہوں نے ایک علمی چیز کر دیا تھا۔ اور ایک سالہ صنعت تینگ
میں لکھا تھا اور قلعیدس کی طرح اسکی شکلیں اور اسکی نسبتیں قائم کی تھیں اور اونکی ہر
قسم کی جھیتیں لکھی تھیں کہ فلاں قسم کا تینگ اتنی دور جا کر یہ کام کرے گا اور فلاں قسم کا
وہ کام کرے گا مگر افسوس ہے کہ وہ سالہ غدر میں ضائع ہو گیا۔

کسی زمانہ میں اونکو تیر اندازی کا شوق ہوتا تو بجز تیر اندازی اور کمانوں اور تیروں کے
بننے اور سہ پہر کو تیر اندازی کے جلسوں کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ جلسے ایسے نہیں
جتنی خوبی اور عمدگی اور شان کو اور اون امر اور سلاطین کے تزلزل کو جو تیر اندازی کے
جلسوں میں آتے تھے بیان کیا جاسکے۔

تیر اندازی کا فن انہوں نے سید محمد متقی خان اقم کے والد سے جو اس فن میں عظیم
تھے سیکھا تھا اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے کمانیں اور

مہر تم کے تیر بناتے تھے انکو باہر تک بنائی ہوئی کانین کشمیر کی بنی ہوئی کھانوں سے یادہ عمدہ
 سمجھی جاتی تھیں۔ بڑی خوبی اون کھانوں میں یہ تھی کہ برسات میں بخ نگر تہیں۔
 تیر اندازی کے لیے گہر میں تیار ہوتا تھا اور تیسرے پہر کوشہر کے اکثر مراہر ریس
 اور بعض سلاطین جمع ہوتے تھے اور نہایت نفیس جلسہ ہر روز ہوا کرتا تھا اور جو صنعت
 اور خوبی تیر اندازی کی ظاہر ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اوس زمانہ میں آبا گنگہ
 ایک تیر انداز تھا جو نہایت کڑی کھان کینیچا تھا۔ مگر حب اون لوگوں کا جو اوس سے نرم
 کھان کینیچے تھے تیر زیادہ تودہ میں کارگر ہوتا تھا تو بڑا لطف ہوتا تھا۔ اوس زمانہ میں
 ایک پیر و مسلمان تھے۔ انکو تیر اندازی کا بڑا شوق تھا۔ میر الامداد لکنا نام پڑ گیا تھا
 کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت الامداد کہا کرتے تھے۔ وہ غریب آدمی تھے۔ سامان تجارتی
 کا انکو نوبت بن العابدی خان دیتے تھے۔ وہ تیر لگانا بھی چاہنا نہیں جانتے تھے۔ مگر
 تیر اندازی کی مجلس میں وہ سب لوگوں کو ہنسائے اور خوش کر دیتے تھے۔ ایک نامی عورت
 ہندو مرصع ساز کو بھی تیر اندازی کا بہت شوق تھا۔ اور تیر لگاتے وقت امده غنی کہتا تھا۔
 اوسکا نام داسد غنی، ہی پڑ گیا تھا۔ ان باتوں کے لکھنے سے ہمارا مطلب یہ ہے
 کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ اوس زمانہ میں کیسی عمدہ صحبتیں تھیں۔ اب وہ خوب اوصاف
 آخر عمر میں ان سب چیزوں کا شوق نہیں رہتا۔ کیسی کیسی کو اور خصوصاً خواجہ
 ہاشم علی خان اپنے بیٹے کو خوش فہم اور لائق اور نیکی اور سعادت مندی میں فرشتہ فصاحت
 تھے یا ضیات میں سے کسی کتاب کا سبق پڑھا دیتے تھے۔

خواجہ فرید الدین احمد کی تین بیٹیاں تھیں ایک غزالیہ نسائیگم والدہ اقم کی دوسری
فاطمہ بیگم اور تیسری فخر النسائیگم۔

غزالیہ نسائیگم نہایت لائق تھیں۔ قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف
قرآن مجید پڑھتی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں مین نے
خود گلستان کے چند سبق اونسے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق
اونکو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں اونکو سبق سناتا یا نیے سبق کا مطالعہ
اونکے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین ٹرین ایک لکڑی مین بندھی
ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس کہہ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہونگی۔ مگر اون
سوت کی لڑون سے مجھے کبھی نار نہیں پڑی۔

اونکی تعلیم اور اونکی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں۔ مجھ کو یاد ہے
کہ ایک شخص نے جسکے ساتھ میں نے نیکی کی تھی۔ میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام
وجہ ثبوت جس سے اوسکو فوجداری عدالت سے کافی نازل سکتی تھی میرے ہاتھ اگئی میرے
نفس نے مجھ کو بھکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے فیض سرنگر مجھ سے کہنا
کہ اگر تم اوسکو معاف کرو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم اوسکی بدی کی حاکم
سے نرا دلوانی ہے تو نہایت ناوانی ہے کہ اوس قوی اور زبردست حاکم بحاکمین کے جنگل
سے جو ہر ایک کے اعمال کی نرا دینے والا ہے اپنے دشمن کو چوڑا کر ضعیف متاوان دینا
کے حاکمون کے ہاتھ ڈالنا چاہو پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے

ہاتھ میں اوسکو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کہیں دشمنیں نہ ہوں۔ اور نہ ہوگا۔ اور جب سے میرے دل میں کبھی شخص سے گواہی نہ ملے گی کہ میرے ہاتھ کیسی ہی دشمنی کی ہوا تھا۔ لیکن کا خیال تک نہیں آیا۔ بلکہ وہی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا ہی اوس سے میرا بدلہ لے۔

جس زمانہ میں میری عکس پر بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڑا ہاتھ کسی بات پر تھپڑ مارا جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اوسکو گھر سے نکال دو جان اسکا دل چاہے چلا جاوے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہا، چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر ٹرک پر چھوڑ دیا۔ اوسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب رہتا تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لگائی۔ میری خالہ نے کہا کہ دو دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں نہ لگایا اس سے بھی خفا ہو گئی۔ مگر میں تم کو چھپا کر کہتی ہوں،، اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکر دن اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ دو دیکھنا آج میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہو سہ ہیں،، تین دن بعد میری خالہ جنکو میں آج جان کہا کرتا تھا میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانیکے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اوس نوکر سے قصور معاف

کر ایسے تو میں معاف کر دوں گی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پہنایا گیا میں نے اس کے آگے ہاتھ
 جوڑے جب تعصیر معاف ہوئی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے
 اونکی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ مرتہ کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہریشہ خبر گیری
 کرتی تھیں۔ زنانہ مکان کے باہر بطور جلو خانہ کے ایک میدان تھا اور اس کے ایک طرف
 مستعد کوٹھراں اور یکدرے ملازموں کے رہنے کے لیے بنے ہوئے تھے غیب اور لاوارث
 بڑھیا عورتوں کو اس میں بہت سی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک لاوارث بڑھیا سماء زینا تھی
 اتفاق سے ایک ماہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زینا بھی بیمار ہوئی بیماری ہی
 قریب قریب ایک ہی تھی۔ جو دوا ان کے لیے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زینا کو پلائی
 تھیں۔ دونوں کو صحبت ہو گئی۔ مگر حکیم معالج نے میری والدہ کے لیے ایک نسخہ
 معجون کا جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ حسب قدر تیار ہوا وہ مقدار میں ایک ہی شخص کے لیے چند
 تک کمانے کے لائق تھا۔ میں اس ماہ میں دلی میں منصف تھا۔ میں اس معجون
 کو تیار کر کے لیگیا اور کہا کہ یہ اتنے دنوں کی خوراک ہے اسکو استعمال فرمائیے۔ انہوں
 نے اسکو لے لیا اور اس خیال سے کہ وہ معجون زینا کے لیے ہی ایسی ہی مفید ہوگی
 جیسی کہ مجھ اور ان کو یقین نہ تھا کہ زینا کے لیے ہی ایسی معجون تیار کر دی جاوے گی۔ اس لیے
 خود انہوں نے اس معجون کو نہیں کھایا اور خفیہ خفیہ زینا کو کھلایا اور اس معجون سے
 زینا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی اسی کے ساتھ اونکی صحت میں بھی ترقی ہو گئی۔ چنانچہ مدینہ میں
 اونے کمالہ اس معجون نے اسکو بہت فائدہ کیا۔ وہ نہیں ان کے کمالہ اور زینا کو نزدیک بغیر وہ کھانا

نہیں دیتا میں متعجب ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ عجوں اور بکے عوض لیا۔ نے
کہائی اور خدا نے دونوں کو صحت عطا کی۔ ایک کو بھیلہ دوا کے اور ایک کو گھنٹھ
اپنے فضل و کرم سے۔

اون کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا روپیہ۔ پیسہ۔ گانون کا یا مالکون کا غلہ مکانوں
کا کرایہ۔ تنخواہ قلعہ کی۔ باغون کا میوہ سب میں سے حساب پانچ فیصدی کے
خدا کے نام علیحدہ کر دیتی تھیں۔ اپنی بہنوں اور بہانچویں پر بھی تاکید تھی کہ سب طرح
پانچ فیصدی کے حساب سے خدا کی اہ پر دیا کریں اور حسب قدر وہیہ اس طرح پر جمع ہوتا
اوسکو نہایت عمدگی اور خوبی اور ایک انتظام سے خیرات میں صرف کرتیں۔

اس طرح پراونکے پاس ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا تھا۔ اور اوس میں سے غریب
پروردہ شین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں امداد کرتیں۔ غریب عورتوں کی جوان لڑکیوں
کے نکاح کو دیتی تھیں اور اس طرح پر بہت سی ان لڑکیوں کا اونکی امداد سے نکاح ہوا ہے۔
نوکری پیشہ یا غریب و مفلس خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتی تھیں اوندکا دوسرا
نکاح کر دینے کی نصیحت کرتیں اور اوندکے نکاح کر دینے کو روپیہ سے امداد کرتیں۔ وہ عموماً
لوگوں کو سمجھاتیں کہ نکاح ثانی نکرنا دوسری چیز ہے مگر نکاح ثانی کو مصیوب سمجھنا یا جسے
نکاح ثانی کیا ہے اوسکو حقیر و ذلیل سمجھنا سخت گناہ ہے۔

غریب ہشتہ داروں کے گھر میں جاتیں اور خفیہ طور پر یا کسی حیلہ سے اوندکی امداد
کرتیں۔ بعض رشتہ دار ایسے بھی تھے کہ انہوں ایسی عورتوں سے شادی کر لی تھی جسے

منا لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ مگر اونکا قول تھا کہ خدا کے حکم سے صلہ رحمی سب پر مقدم ہے وہ خود اونسکے گھر جاتین اور اونسکی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتین اور اونسکے ساتھ سلوک کرتین۔

اونکو ہر ایک بات میں خدا پر بہت توکل تھا وہ یہ کہہ کر تین تھین کہ ”و کہہ بیماری میں علاج کرنا۔ دوا دینا صرف ایک حیلہ ہے۔ شفا دینے والا خدا ہے۔ اگر دوا اور حکیموں کے علاج سے لوگ مرانہ کرتے تو سب لوگ خدا کو بھول جاتے، وہ کہتی تھین کہ ”اگر سیتلہ کے پوجنے سے لڑکیاں لڑکے سیتلہ کی بیماری سے نمٹتے تو تمام دنیا بچاؤ کے جنگو خدا بچاتا کا فر ہو جاتی۔“

کبھی کوئی سنت و نذر و نیاز کسی امر کے لیے انہوں نے نہیں مانی۔ گندے تعویذ پر اور تاریں خون یا دلوں کی سعادت و خوشی پر اونسکو مطلق عقائد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اونسکو منع نہ کرتین اور کہتین کہ اگر لوگوں کو اس سے منع کیا جاوے اور نہ کرنے دیا جاوے اور اتفاق سے وہ ہمیش آجاوے جسکے خوف سے وہ گندے تعویذ کرتے ہیں یا سعادت و خوشی دیکھتے ہیں تو اونسکے ایمان میں زیادہ خلل آجاوے گا اور وہ یقین کرینگے کہ ایسا نہ کرنا سے یہ ہوا اور اگر ایسا کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ اونسکا قول تھا کہ ہر بات کے لیے صرف خدا دعا کی جاوے پھر وہ جو جاہگاہہ کرے گا۔

وہ کہتی تھین کہ ”بصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اس میں بھی خدا کی کچھ حکمت ہوتی ہے۔ مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔“

میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور اونکے خاندان سے بہت عقیدت تھی گوری
والدہ کو حضرت شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی اور شاہ صاحب کے ہاں اس قسم کی
باتوں کا پتہ بھی نہ تھا۔ اونکی عادت تھی کہ جب کوئی اونکے پاس کوئی حاجت لیجاتا تو وہ
اوس وقت ہاتھ اوٹھاتے اور سب حاضرین سے کہتے کہ دو دعا کرو کہ خدا اسکی آرزو پوری
کرے،، یہی عقیدہ میری والدہ کو بھی سچا تھا۔

میری ننھیال کے بعض لوگ تو ہما میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں کچھ
ہوتا تھا اوپر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اونکے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو
بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا
تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اوسکے خون سے لکھا
جاتا تھا اور جس لڑکے کو پھنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈیا مرغی کھانے کا اوسکو
امتناع ہوتا تھا۔

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی اونکی ننھیال والوں نے وہ
گنڈہ پھنایا۔ مگر میری والدہ کو خیال تھا کہ اس گنڈہ کے سبب سے انڈیا مرغی نہ کھانا
اور یہ سمجھنا کہ اگر کمادینگے تو کوئی آفت اونکی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے۔ وہ
اون دونوں لڑکوں کو جب کہی ہوا انکے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی
جس میں انڈیا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل اونکو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے
پراٹھے اور انڈیا پسند کرتے تھے۔ بے تامل اونکو کھلا دیتی تھیں۔

میں جب لی مین منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ دو جہان جہانِ تمہارا
 لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو تم وہاں کہیں سواری پر جایا کرو
 کہیں پیادہ پا۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ پس ایسی عادت
 رکھو کہ ہر حالت میں اوسکو نباہ سکو، چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب
 کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ اکثر دنوں جبکہ پیدل جاتا تھا اور کہیں
 سواری پر۔

میرے بہائی سید محمد خان اور حکیم غلام نجف صاحب سے بہت دوستی تھی آپس میں
 بہائی بہائی کہتے تھے۔ میں بھی ان کو اپنے بڑے بہائی کی برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خان
 کے انتقال کے بعد جب میں اہلی مین منصف ہو کر آیا تو میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب
 سے ملتا تھا۔ ہفتہ میں دو روز ان کے پاس جاتا تھا اور وہ بھی وقت معین میں میرے پاس
 آتے تھے۔ اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس
 جاتا رہا اور ملتارہا۔ مگر انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک میں نے اس کا کچھ
 خیال نہ کیا۔ آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ
 نے مجھ سے کہا کہ ”میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو
 اس کا کیا سبب ہے؟“ میں نے جوابات تہی وہ کہی انہوں نے کہا ”وہ نہایت افسوس ہے
 کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جہاں دوستی ہے اور کلا
 پور کرنا چاہیے۔ یہ تمہارا فرض ہے اور اوس دست کو دوستی کا پورا برابر بناؤ اور اس کا

فرض ہے تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے کیوں فرما رہے ہو۔ تم کو بہتر ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔“۔

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پایا۔ بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشش کا یا فاتحہ دیکر کمانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔

میں ان دنوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی بجز اس صورت کو کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جاوے نیابت کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس زمانہ کے وہابیوں یا اہل حدیث کے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ گو وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا ادب سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے اور بہت کم آدمی اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ سید محمد خان ان کے بڑے بیٹے نے سینٹیل میں برس کی عمر میں انتقال کیا۔ میری والدہ اور تمام لوگ چھوٹے بڑے ان کے زمانہ بیماری میں بیمار داری اور علاج معالجہ میں مصروف تھے۔ میری والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھتی تھیں

قریب ایک مہینہ کے وہ بیمار ہے۔ آخر کار ایک دن صبح کے وقت اس کا انتقال ہو گیا۔ سب لوگ گریہ زاری کرنے لگے۔ جو رنج و غم و کلو ہوگا وہاں ہوگا ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کسی کو نہوا ہوگا۔ بے اختیار اونکی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اسی حالت میں انہوں نے کہا کہ ”خدا کی مرضی“، اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور شراعت تک مصلے پر سے نہیں اٹھیں۔ میں اس زمانہ میں فتحپور سیکری میں منصف تھا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرائی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی (دختر) کی شادی اوسنی مانہ میں قرار چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے۔ اور وہ تمام سامان شادی کا کر چکی تھیں کہ سید محمد خان کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ دستور ہے اون لوگوں نے اس لڑکی کی شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن اپنے بڑے بیٹے کے انتقال اور ایسے سخت صدمہ کی حالت میں خود اون رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ دو مہینہ بیٹی کی شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ تاثر کہنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا اور جو امر کہ خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم ہرگز شادی کو ملتوی مت کرو۔ اور جبکہ میں خود تمہارے گھر میں آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔“

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال۔ اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق۔ دانشمند اور دراندیش۔ فرشتہ صفت بی بی تھیں اور

ایسی بان کا ایک بیٹے پر جب کی اوسنے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔
 وہ بھگوان نصیحت کرتی تھیں کہ اگر کسی نے ایک دفعہ تمہاری ساتھی کی ہو اور بُرائی
 کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ بُرائی کرے تو تم کو آزدہ نہونا چاہیے۔
 کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی اور ایک یا دو دفعہ کی بُرائی برابر ہو گئی۔ مگر نیکی ایسی چیز
 ہے کہ اوسکے بعد نیکی کرنیوالا کیسی ہی بُرائی کرے اوسکی نیکی کے احسان کو بُھلایا
 نہیں جاسکتا۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی نیک بی بی کو اخیر عمر میں تکلیف پہنچی۔ جس زمانہ میں
 غدر ہوا میں بخوبی صدرا میں تھا اور میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب
 عزیز و اقارب دہلی میں۔

وہ زمانہ غدر میں لوگوں سے کتنی تھیں کہ درانگریز تھوڑے دنوں میں پہر آجائے
 تم سب خاموش اپنے گھر دن میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہو گئے لگنے
 اوں کو کچھ نہیں کہنے کے۔

اؤں کو یقین کامل تھا کہ درانگریز بھڑاؤں کے جنہوں نے فساد کیا ہے کسی کو کچھ
 تکلیف نہیں دینے کے، جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری روازہ فتح ہو گیا۔
 سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے۔ مگر وہ اور اونکی ایک بہن جہانمیا تھیں
 اسی یقین پر کہ انگریز بیگانا ہوں کو نہیں ستانے کے اپنے گھر سے نہیں گئیں۔
 مگر افسوس کہ اونکا خیال غلط نکلا اور حب دہلی فتح ہوئی تو سب اہی گھر دن میں

گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا۔ وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو پہونچ کر اس کو ٹھہری میں چلی آئیں جس میں نیا لادارت بڑھیا رہتی تھی۔

اسٹھ دس دن انہوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔ اس عرصہ میں ان کو جو تھکاوٹ میں گیا تھا میرٹھ سے دہلی پہونچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا اور قوت میں آئے اور ان کے پاس کہانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا اسی پر بہتری۔ دودن سے پانی بھی ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔

میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ زمین تم یہاں کیوں آگئے یہاں لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ ہم پر جو گدز لگی۔ گذر لگی۔“

میں نے کہا اور آپ خاطر جمع رکھیے مجھے کوئی نہیں مارے گا میری پاس سب حاکموں کی چٹیاں ہیں اور میں اس ہی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔“ اور ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دودن سے پانی مطلق نہیں پایا ہے۔

میں پانی کی تلاش کو نکلا پانی اور طرفت کیں نہیں ملا۔ کھنودن پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے پانی نکالا جاسکے۔ ناچار یہ قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لکیر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہونچا تو دیکھا کہ وہی لادارت بڑھیا اس کے پرٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آنچورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گیا اور پرلوٹھا نکلیا

مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے۔ دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے
اوسکے آنچورہ میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے، اوسنے کپ کپ پاتے ہاتھوں سے
آنچورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا۔ اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جسکا
مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب پیاسی ہیں انکے لیے پانی لیجاؤ گی اور اسی غرض سے
پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔

میں نے کہا اور میرے پاس پانی بہت ہے میں لے آیا ہوں تو پانی پی لے
پھر آنچورہ میں پانی دیا۔ اوسنے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا
اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔
اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کر کے اونکو میرٹھ لیجاؤں جب
اوس مقام پر پہونچا جہاں بڑبھائی بالیٹی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے سارے شہر میں
باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کا حکم قلعہ نے
اجازت دی کہ شکر مر جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے جکو دیدی جاوے۔ میں وہ
شکر مر لیکر گھر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اوس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

غشی الطاف حسین صاحب مرثیہ دارکشتری میرٹھ نے جو میرے ساتھ بچپن سے
کیلے ہوئے تھے اور انکے خاندان اور میرے خاندان سے ارتباط قدیمی تھا میرے
رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ انکے اس احسان کو یاد کرتا ہوں۔
اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جاوہ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور

صفر کی نہایت شدت ہو گئی۔ جو دو ماہِ ذی الحجۃ و ذی القعدہ کی تھی وہ قی ہو جاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہو جاتی کبھی شدت ہو جاتی۔ آخر کار اسی مرض میں یکم ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ ہجری مطابق ۱۸۳۱ء کے انہوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مگر اونکی نیک نیتی کا یہ نتیجہ کہ انتقال سے چند روز پیشتر اونکی بیٹی اور نوایان اور پوتے اور پوتیاں اور بہو و بیٹیں جو مختلف مقامات میں چلی گئی تھیں سب انکے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے سب کو صحیح و سالم اور خیر و عافیت سے دیکھ کر نہایت خوشی کی تھی۔

انہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ اونکو بغلی قبر میں جو سنوں میں دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہ کسی کہ اونکو ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو اونکی یہی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اوس قدر دنوں کی نماز نکاح اب کر کر کفارہ کے گے کیوں غریبوں کو دیدینا جبکہ دوسرے دن انہوں نے قضا کی تو میں نے اونکی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مَدَنی

۲

الخیر



اطلاع

اگرچہ یہ کتاب قلیل الاجزاء ہے مگر اسکی قیمت
ایک وپیہ قرار پائی ہے اس لیے کہ جس قدر
کتابیں فروخت ہونگی اونکی قیمت مدرستہ العلوم
مسلمانان واقع علی گڑھ کو دی جاوے گی پس
خریدار اسکی قیمت کو گران سمجھیں گو بلکہ یہ کمنگاہ

سفال چند و آدم جان خریدم
تعالی اللہ نہ ہی ارزان خریدم

